اہلِ سنت کون؟

حافظ ابو یحییٰ نورپوری

قوام السنہ امام ابوالقاسم الاصبہانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہم آپ کی سنت کو صحیح احادیث کے ذریعے پہچان پاتے ہیں، اہلِ حدیث سب سے بڑھ کر صحیح احادیث کو تلاش کرتے، ان میں دلچسپی رکھتے اور ان کی پیروی کرتے ہیں، چنانچہ قرآن وسنت سے ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ اہلِ حدیث ہی اہلِ سنت ہیں، کیونکہ کسی بھی پیشے کی طرف نسبت کرنے والا اس وقت اپنے دعوے میں جھوٹا ہو گا، جب اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہو گی اور ہر کاریگر اپنے پیشے سے متعلق آلے کے ذریعے اپنے پیشے کو ثابت کرتا ہے، مثال کے طور پر جب آپ کسی شخص کو دیکھیں کہ وہ اپنی دکان کا دروازہ کھولے ہوئے ہو، اس کے سامنے لوہے والی بھٹی اور ہتھوڑا وغیرہ پڑا ہو تو آپ فوراً پہچان لیں گے کہ وہ لوہار ہے، اسی طرح جب کوئی اپنے سامنے سوئی اور قینچی وغیرہ رکھے ہوئے ہو تو پہچان لیں گے کہ وہ درزی ہے، یہی حال باقی پیشوں کا ہے، اس کے برعکس اگر کوئی کھجوریں بیچنے والا خوشبو فروش کو کہے کہ میں بھی خوشبو فروش ہوں، تو وہ کہے گا کہ تو جھوٹا ہے، نیز ہر دیکھنے والا آدمی اس کی تائید کرے گا۔

ہم نے اصحاب الحدیث کو دیکھا ہے کہ وہ احادیثِ نبویہ کی تلاش میں نکلے، معتبر مصادر سے ان کو لے کر ان کو جمع اور حفظ کیا، ان کی پیروی کی دعوت دی اور ان کے مخالفین پر تنقید کی، ان کے پاس احادیث کا ذخیرہ تھا، لہٰذا جس طرح بزاز (کپڑا فروش) اپنے کپڑے، کھجور فروش اپنی کھجوروں اور عطر فروش اپنے عطر کی نسبت سے مشہور ہو جاتے ہیں، اسی طرح یہ ان احادیث کے ساتھ مشہور (ہو کر اہلِ حدیث معروف) ہو گئے، جبکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ احادیثِ صحیحہ کی معرفت اور اتباع سے روگردانی اختیار کیے ہوئے ہیں، احادیثِ صحیحہ میں بے تکے اعتراضات کرتے ہیں، لوگوں کو ان کی تدوین واشاعت سے روکتے ہیں، نیز احادیث اور اہلِ حدیثوں کے لیے نازیبا مثالیں بیان کرتے ہیں۔

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ جو احادیثِ صحیحہ کو جمع کرنے، یاد کرنے اور ان کی اتباع کرنے کے شائقین ہیں، وہی اہلِ سنت کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں، کیونکہ علماء کے ہاں سنت کا اتباع صحیح سند والی احادیثِ نبویہ کو لے کر آپ کے احکام پر عمل اور نواہی سے اجتناب کا نام ہے۔ یہ واضح دلیل ہے کہ آراء واہواء کے متبعین کی بجائے یہی لوگ اہلِ سنت نام کے مستحق ہیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ بات تو ایسے ہی ہے، لیکن ہر فرقہ اپنے کی تائید کے لیے دلائل حدیثیہ پیش کرتا ہے، تو اسے ہمارا یہی جواب ہو گا کہ جو صحیح حدیث کے مقابلے میں ضعیف، متصل کے مقابلے میں مرسل یا مرفوع کے مقابلے میں موقوف سے حجت پکڑتا ہے، وہ اہلِ حدیث کے برابر نہیں ہو سکتا۔ جو فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتا ہے، وہ قطعی دلیل کا متبع ہے اور جو قوی و صحیح حدیث سے حجت لیتا ہے، وہ کمزور وضعیف روایت سے حجت لینے والے سے بدرجہا بہتر ہے۔

یوں معلوم ہوا کہ صاحبِ سنت صرف قوی و صحیح حدیث کی پیروی کرتا ہے، جبکہ صاحب الرائے صرف اس حدیث کی پیروی کرتا ہے جو دل کو بھاتی ہے۔'' (الحجة : ٢/٢١٣-٢١٤)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

السنۃ

جہلم

جلد نمبر ا　　شمارہ نمبر: ا

ذی القعدہ ۱۴۲۹ھ، نومبر ۲۰۰۸ء

فقه السنة: غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

عن أبي سعيد قال : خرج علينا رسول الله صلّى الله عليه وسلّم ونحن نتذاكر المسيح الدّجال ، فقال : ألا أخبركم بما هو أخوف عليكم عندي من المسيح الدجال ؟ قال : قلنا: بلىٰ ، فقال : الشّرك الخفيّ ، أن يقوم الرّجل يصلّي فيزيّن صلاته لما يرىٰ من نظر رجل .

''سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف آئے ،ہم مسیح دجال کے بارے میں باتیں کررہے تھے،آپ نے فرمایا،کیا میں تمہیں اس سے زیادہ خطرناک چیز کے بارے میں نہ بتاؤں؟ ہم نے عرض کی ، کیوں نہیں ،فرمایا،وہ شرک خفی ہے کہ آدمی نماز میں کھڑا ہوتو دوسرے آدمی کے دیکھنے کی وجہ سے نماز کو خوب سنوار کر پڑھے۔'' (مسند الامام احمد : ۳۰/۳،سنن ابن ماجه : ۴۲۰۴، وسنده حسن، وربيح بن عبدالرحمن وثقه الجمهور)

۱......ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں پر مہربان تھے،ان کو ایک فتنہ سے آگاہ کیا اور ڈرایا۔

۲......زمین پر بہت سارے فتنے جنم لے لیں گے۔

۳......قربِ قیامت مسیح دجال کا فتنہ ظہور پذیر ہوگا۔

۴......دجال کو ''مسیح'' اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں ایک حسی عیب یہ ہوگا کہ اس کی دائیں آنکھ ممسوح (بند) ہوگی۔

۵......دجال انسان ہوگا۔

۶......دجال معنوی عیوب دجل ومکر اور کذب وزُور جیسی قبیح صفات سے متصف ہوگا۔

۷......آدم علیہ السلام سے لے کر برپا ہونے والے فتنوں میں فتنہ دجال سب سے بڑا ہوگا۔

۸......اللہ تعالیٰ کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے،خواہ اس حکمت تک ہماری رسائی نہ ہوسکے۔

۹......اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو فتنوں میں آزماتا ہے۔

۱۰......فتنوں سے خبردار اور بچ کر رہنا چاہیے۔

۱۱......علمائے دین کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو فتنوں سے آگاہی دیں۔

۱۲......علمی مجالس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

۱۳......شرک کی دو قسمیں ہیں،ایک شرکِ جلی،جیسے غیر اللہ کے سامنے رکوع وسجود کرنا،تعظیماً جھکنا وغیرہ،دوسری قسم شرکِ خفی ہے،جس کا تعلق دل سے ہے،وہ ریاکاری ہے،سوائے اللہ کے اسے کوئی نہیں جانتا۔

۱۴......دکھاوے کی نماز شرکِ اصغر یا شرکِ خفی ہے۔

۱۵......شرکِ اصغر کبیرہ گناہ اور حرام وممنوع ہے۔

۱۶......جھوٹی تعریف اور تعظیم کا متمنی شرکِ اصغر میں مبتلا ہوتا ہے۔

۱۷......نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے بارے میں ریاکاری سے ڈرتے تھے۔

۱۸......بسا اوقات ظاہری وحسی فتنہ سے باطنی فتنہ زیادہ مضرت کا باعث ہوتا ہے۔۱۹......شرک ہر صورت میں مذموم ہے۔

۲۰......اللہ تعالیٰ ہر قسم کے شرک سے بیزار اور پاک ہے۔۲۱......اعمالِ صالحہ کے لیے اخلاص شرط ہے۔

۲۲......قلبی اعمال پر بھی پکڑ ہو سکتی ہے۔۲۳......اصلاحِ قلب ضروری ہے۔

۲۴......ظاہر باطن کے تابع ہوتا ہے۔۲۵......کبائر کا مرتکب ملتِ اسلامیہ سے خارج نہیں ہے۔

۲۶......نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کے بارے میں آگاہی اللہ کے حکم سے دی ہے۔

۲۷......مردوں کے خطاب میں عورتیں بھی برابر کی شریک ہوتی ہیں، الا یہ کہ ان کے بارے میں خصوصی حکم جاری ہو جائے۔

۲۸......گناہوں کے مراتب میں تفاوت ہوتا ہے۔

۲۹......اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی ایمان کے لیے باعثِ مَضرت ہوتی ہے۔

۳۰......جلوت و خلوت دونوں حالتوں میں کسی عمل کا التزام اس کے ریا کاری سے مبرا ہونے کی دلیل ہے۔

☆ ☆ ☆

اھل شرک کی مثال

ابوعبداللہ

فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ﴾ (العنکبوت: ۴۱)

’’ان لوگوں کی مثال جو اللہ کے علاوہ کارساز بنائے ہوئے ہیں، مکڑی جیسی ہے‘‘

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:

’’اس مثال میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مشرکین کمزور ترین مخلوق ہیں، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کارساز بنائے ہیں، لیکن وہ ان سے کمزوری کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے ’’انہوں نے مدد کے لیے اللہ کے علاوہ معبود بنائے، لیکن وہ (معبود) ان کی مدد کی استطاعت نہیں رکھتے اور وہ (روزِ قیامت) ان کے سامنے لشکر کی صورت میں حاضر کیے جائیں گے۔‘‘ (یٰس: ۷۴-۷۵) ایک مقام پر فرمایا ’’انہوں نے اللہ کے علاوہ معبود بنائے تاکہ وہ ان کے لیے طاقت کا سبب بنیں، ہرگز نہیں، عنقریب وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے مخالف ہوں گے۔‘‘ (مریم: ۸۱-۸۲) ایک جگہ مشرک قوموں کی ہلاکت کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا ’’ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا تھا، بلکہ انہوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا، جب اللہ کا عذاب آیا تو ان کے وہ معبودان باطلہ ان کو ذرا بھی نہ بچا سکے، جن کو وہ پکارا کرتے تھے، انہوں نے ان کو ہلاکت کے علاوہ کچھ نہ دیا۔‘‘ (ھود: ۱۰۱)

یہ چاروں مقاماتِ قرآنی وضاحت کرتے ہیں کہ جو بھی اللہ کے سوا کسی کو قوت، بڑھوتری اور مدد کے لیے کارساز بناتا ہے، اسے اس سے اپنے مقصود کے برعکس نتیجہ حاصل ہوتا ہے، قرآن میں اس طرح کی اور مثالیں بھی ہیں، لیکن شرک کے بطلان، مشرک کے خسارے اور خلافِ توقع نتائج کے حصول کی یہ واضح مثال ہے۔‘‘ (کتاب الأمثال: ۳۱)

ایمان کیا ہے؟

غلام مصطفٰی امن پوری

اہل سنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں اور یک زبان ہیں کہ:

الایمان تصدیق بالجنان(ای القلب) واقرار باللسان وعمل بالارکان .

''ایمان دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضاء وجوارح کے ساتھ عمل کا نام ہے۔''

ایمان کی یہی تعریف سلف صالحین نے ان الفاظ سے کی ہے: **قول و عمل .**

''ایمان (دل اور زبان کے) قول اور (دل اور اعضاء کے) عمل کا نام ہے۔''

امام بخاری ایمان کی تعریف میں فرماتے ہیں: وھو قول وفعل۔

''ایمان (دل اور زبان کے) قول اور (دل اور اعضاء کے) فعل کا نام ہے۔''

ان تمام تعریفوں میں کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ شرع میں عمل کا اطلاق قول وفعل پر بھی ہوتا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعریفِ ایمان میں سلف کی مختلف عبارات کے بارے لکھتے ہیں:

والمقصود هنا أن من قال من السلف : الايمان قول و عمل ، أراد قول القلب واللسان وعمل القلب والجوارح ، ومن أراد الاعتقاد رأى أن لفظ القول لا يفهم منه الا القول الظاهر أو خاف ذلک فزاد الاعتقاد بالقلب ، ومن قال : قول و عمل ونية ، قال : القول يتناول الاعتقاد وقول اللسان ، وأما العمل فقد لا يفهم منه النية ، فزاد ذلک ، ومن زاد اتباع السنة فلان ذلک كله لا يكون محبوبا لله الا باتباع السنة ، وأولئک لم يريدوا كل قول و عمل ، انما أرادوا ما كان مشروعا من الأقوال والأعمال ، ولكن كان مقصودهم الرد على المرجئة الذين جعلوه قولا فقط، فقالوا : بل قول و عمل .

''جن اسلاف نے ایمان کو قول وعمل کہا ہے، ان کی قول سے مراد دل وزبان کا قول ہے اور عمل سے قلب وجوارح کا عمل مراد ہے، جنہوں نے یہ سوچا ہے کہ لفظِ قول صرف ظاہری قول کے لیے مستعمل ہے، انہوں نے اعتقادِ قلب کا لفظ بڑھا دیا، جنہوں نے قول، عمل اور نیت سے ایمان کو تعبیر کیا، ان کے ہاں قول اعتقاد اور ظاہری الفاظ دونوں کو شامل ہے، جبکہ عمل سے نیت کا مفہوم نہیں ملتا، لہٰذا نیت کا لفظ بڑھا دیا، اتباعِ سنت کا لفظ اس تعریف میں شامل کرنے والوں کے ذہن میں یہ توجیہ تھی کہ اتباعِ سنت کے بغیر اللہ تعالیٰ کو کوئی عمل پسند نہیں آتا، یعنی انہوں نے ہر قول وعمل کو ایمان کہا، سب کا مقصود مرجئہ کا رد کرنا تھا، جو ایمان کو صرف قول قرار دیتے تھے، سلف نے عمل کو بھی اس میں شامل کر دیا۔''

(مجموع الفتاوٰی : ۱۷۱/۷)

اہل سنت والجماعت کی اس متفقہ تعریف کے خلاف امام ابوحنیفہ ایمان کی تعریف سے عمل کو خارج کرتے ہیں، جیسا کہ امام وکیع بن الجراح فرماتے ہیں:

ولقد اجترأ أبو حنيفة حين قال : الايمان قول بلا عمل .

''ابوحنیفہ نے یہ کہہ کر بڑی جسارت کی ہے کہ ایمان صرف قول کا نام ہے، عمل کا نہیں۔''

(الانتقاء لابن عبد البر: ۱۳۸، وسندہ صحیح)

جناب عبدالحق حقانی دیوبندی ایمان کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

''ایمان فقط تصدیق قلب کا نام ہے۔'' (عقائد الاسلام از عبد الحق حقانی: ۱۳۳)

جو لوگ ایمان کے مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کے اجماع کے مخالف ہیں، ان کو سنی کہلانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

ایمان کا لغوی معنی و مفہوم:

لفظِ ایمان بابِ افعال کا مصدر ہے، اس کے لغوی معنیٰ میں دو مشہور اقوال ہیں:

ا......اکثر اہل لغت کا کہنا ہے کہ ایمان کا لغوی معنیٰ تصدیق ہے، وہ اس پر اجماع کا دعوی بھی کرتے ہیں، چنانچہ ازہری کہتے ہیں: اتفق أهل العلم من اللغوية وغيرهم أن الايمان معناه التصديق.

''لغوی اور دوسرے اہل علم کا اتفاق ہے کہ ایمان کا معنیٰ تصدیق ہے۔'' (تہذیب اللغۃ: ۵/۵۱۳)

اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ﴾ (یوسف: ۱۷)

''(یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ سے کہا) کہ آپ ہماری تصدیق کرنے والے نہیں، حالانکہ ہم سچے ہیں۔''

یہاں ایمان بمعنیٰ تصدیق ہے۔

ا......سلف صالحین کے نزدیک ایمان لغت میں دو معانی کے لیے آتا ہے:

(ا) جب ''با'' کے ساتھ ہو تو تصدیق کے معنیٰ میں ہوتا ہے، جیسے فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۸۵)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں نے رب کی طرف سے اپنی طرف نازل ہونے والی کلام کی تصدیق کی۔''

(ب) جب ''لام'' کے ساتھ متعدی ہو تو پھر بات ماننے کی معنیٰ میں ہوتا ہے، جیسے ﴿وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا﴾ (یوسف: ۱۷) اور ﴿فَآمَنَ لَهٗ لُوْطٌ﴾ (العنکبوت: ۲۶) میں ہے۔

سلف صالحین نے ایمان کو صرف تصدیق کے ساتھ خاص کرنے کا رد کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ایمان میں اگرچہ تصدیق بھی شامل ہے، لیکن وہ صرف تصدیق کا نام نہیں، بلکہ اقرار وطمانینت بھی اس میں شامل ہے، ان کا استدلال درج ذیل تین طرح سے ہے:

(ا) لفظِ ایمان ''با'' اور ''لام'' دونوں کے ساتھ متعدی ہوتا ہے، جبکہ لفظِ تصدیق یا تو خود ہی متعدی ہوتا ہے یا ''با'' سے۔

(ب) ایمان میں امن، تصدیق اور امانت، تین معانی پائے جاتے ہیں، جبکہ تصدیق میں امن اور امانت کے معانی موجود نہیں۔

(ج)ایمان صرف خبرِ غائب کے بارے میں استعمال ہوتا ہے،سورج طلوع ہو گیا،تو اس کے لیے لفظِ ایمان نہیں ، بلکہ تصدیق مستعمل ہو گا ، کیونکہ وہ غائب نہیں رہا، اس کے برعکس لفظِ تصدیق غائب و حاضر دونوں طرح کے امور کے لیے استعمال ہو جاتا ہے۔

(د)ایمان کی ضد کفر ہے اور اس میں صرف تکذیب نہیں ہوتی ، بلکہ یہ عام ہے ، بسا اوقات حقیقت جانتے ہوئے بھی مخالفت کی جاتی ہے، یہ بڑا کفر ہے، جبکہ تصدیق کی ضد صرف تکذیب ہے۔

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ ایمان صرف تصدیق کا نام نہیں ، بلکہ یہ کچھ اور چیزوں کو بھی شامل ہے۔

۲......اللہ کی کلام اور شریعت خبر اور امر دو چیزوں پر مشتمل ہے،خبر کے لیے تصدیق اور امر کے لیے انقیادِ ظاہری ضروری ہے، جب خبر کو تصدیق اور امر کو اطاعت کے ذریعے قبول کیا جائے ،تب اصل ایمان حاصل ہوتا ہے۔

اگر اہل لغت کی طرح ایمان کو صرف تصدیق کہا جائے تو ایمان کا ایک جزو حاصل ہو گا، دوسرا رہ جائے گا۔

واضح رہے کہ ابلیس کا کفر تصدیق نہ کرنے کی وجہ سے نہ تھا، اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو سن کر اس حکم کی تکذیب نہیں کی ، بلکہ ظاہری اطاعت سے انکار کیا تھا، اس تکبر کی وجہ سے وہ کافر قرار پایا۔

ایما ن کو صرف تصدیق قرار دینے کے نقصانات:

متاخرین میں سے بہت سارے لوگ اس مسئلہ میں پھسل گئے ہیں اور یہ سمجھ لیا ہے کہ ایمان صرف تصدیق کا نام ہے،لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ ابلیس اور فرعون نے تکذیب نہیں کی یا یہ تکذیب صرف زبانی تھی ، دل سے انہیں معلوم تھا،تو پریشان ہو جاتے ہیں۔

ایسے لوگ اگر سلف صالحین کی بتائی ہوئی راہ پر چل پڑیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ایمان قول و عمل کا نام ہے، یعنی اللہ و رسول اور ان کی تعلیمات کی دل سے تصدیق ، زبان سے ان کا اقرار اور اعضاء سے عمل بجالانا ہے۔

تصدیق و انقیاد میں سے کوئی چیز رہ جائے تو ایمان نہیں رہتا ، اگر تصدیق موجود ہے،لیکن تکبر و عناد ظاہری انقیاد سے مانع ہے تو بھی ایمان نہیں ، جیسے ابلیس کا کفر تکذیبی نہیں ، بلکہ استکباری ہے، اس کے برعکس عیسائیوں کا کفر جہالت کی وجہ سے تکذیبی ہے، جبکہ یہودی جانتے بوجھتے اسلام کی ماتحتی سے انکاری ہیں ، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کا ایک گروہ آیا ،آپ سے کچھ سوالات پوچھے ، آپ نے ان کے جواب دے دیئے ، تو کہنے لگے ، ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں ،لیکن اس کے باوجود انہوں نے آپ کا اتباع نہیں کیا۔(مسند احمد : ۲۳۹/٤، سنن نسائی : ٤٠٨٣، جامع ترمذی : ۲۸۳۳،۳۱٤٤ وقال : حسن صحیح، ابن ماجه : ۳۷۰۵، وسنده صحیح)

وقال الحاکم : هذا حدیث صحیح لا نعرف له علة بوجه من الوجوه . (المستدرك : ۱/ ۹)

ووافقه الذهبی

ثابت ہوا کہ ایمان کے لیے تصدیق کے ساتھ ساتھ ظاہری اطاعت بھی اعمال کی صورت میں ضروری ہے، ورنہ ابلیس کا کفر کیسا؟

۳......اہلِ لغت نے اس آیت ﴿وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا﴾ (یوسف: ۱۷) میں ایمان کا معنٰی جو تصدیق کیا ہے، وہ صحیح نہیں، کیونکہ سلف صالحین نے اس کی تفسیر ''اقرار'' سے کی ہے، نیز یہ تفسیر ''تصدیق'' سے زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ لفظِ ایمان جب ''لام'' کے ساتھ متعدی ہو تو اقرار کے معنٰی میں ہوتا ہے نہ کہ تصدیق کے معنٰی میں، اس معنٰی میں تب ہوتا ہے، جب خود بخود متعدی ہو یا ''با'' کے ساتھ متعدی ہو۔

عبادت کیا ہے؟

ابو عبداللہ

عبادت کی سب سے جامع تعریف حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے کی ہے:

''عبادت ایک جامع لفظ ہے جو اللہ تعالیٰ کے تمام پسندیدہ و محبوب، ظاہری و باطنی اقوال و افعال کو شامل ہے، چنانچہ نماز، زکوۃ، روزہ، حج، سچائی، امانت کی ادائیگی، والدین سے حسن سلوک، رشتہ داروں سے نیکی، وعدوں کو پورا کرنا، نیکی کا حکم، برائی سے روکنا، کفار و منافقین سے جہاد، پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور زیردست انسانوں اور جانوروں کے ساتھ بھلائی، نیز دعا، ذکر، قراءت وغیرہ سب عبادات ہیں، اسی طرح اللہ و رسول سے محبت، اللہ کا ڈر، اس کی طرف رجوع، خالص اسی کی عبادت، اس کے حکم پر ڈٹ جانا، اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرنا، اس کی قضاء و قدر پر راضی ہونا، اس پر توکل کرنا، اس کی رحمت کی امید اور اس کے عذاب کا خوف وغیرہ بھی عبادات ہیں۔'' (العبودیۃ: ۸)

عبادت کی اقسام:

اس جامع تعریف سے معلوم ہوا کہ عبادت اقوال اور ظاہری و باطنی اعمال سب کو محیط ہے، لہٰذا عبادات قولی بھی ہیں، عملی بھی ہیں اور اعتقادی بھی، یعنی عبادت دل سے بھی ہوتی ہے، زبان سے بھی اور دوسرے اعضاء سے بھی۔

اعتقادی عبادات: یہ عبادت اس عقیدے پر مشتمل ہوتی ہے کہ تمام مخلوقات اللہ ہی کی تخلیق ہیں، اسی کے پاس تصرف ہے اور اس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، نیز صرف وہی ذات اس قابل ہے کہ اس کے لیے محبت، رجاء، خوف، خشوع، رجوع، توکل اور اخلاص کا مظاہرہ کیا جائے، یہی دلی عبادت ہے۔

قولی عبادت: یہ عبادت اللہ و رسول پر ایمان کی گواہی، قرآن کریم کی تلاوت، ہر حال میں ذکرِ الٰہی، دعا اور راست گوئی وغیرہ پر مبنی ہے، اسے ہی زبانی عبادت کہتے ہیں۔

عملی عبادت: اس میں طہارت، نماز، زکوۃ، روزہ، حج، جہاد فی سبیل اللہ اور اعضائے جسمانی سے صادر ہونے والے واجب و مباح کام شامل ہیں، یہی بدنی عبادت کہلاتی ہے۔

قبولیتِ عبادت کے لیے دو ضروری شرطیں ہیں: اخلاص اور اتباعِ سنت۔

دفاعِ حدیث:

متنفل کی اقتدا میں مفترض کی نماز جائز ہے: حافظ ابو یحییٰ نورپوری

دلیل نمبر 1:

عن جابر قال: كان معاذ يصلّى مع النّبى صلّى اللّٰه عليه وسلّم ، ثمّ يأتى فيؤمّ قومه ، فصلّى ليلة مع النّبى صلّى اللّٰه عليه وسلّم العِشاء ، ثمّ أتىٰ قومه فامّهم ، فافتتح بسورة البقرة ، فانحرف رجل فسلّم ، ثمّ صلّى وحده وانصرف ، فقالوا له : أنافقت يا فلان ؟ قال: لا والله ! ولآ تينّ رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم فلأخبرنه ، فأتى رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم فقال : يا رسول اللّٰه ! انا أصحاب نواضح ، نعمل بالنّهار ، وانّ معاذا صلّى معك العشاء ، ثمّ أتىٰ فافتتح بسورة البقرة ، فأقبل رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم علىٰ معاذ فقال: يا معاذ! أفتّانٌ أنت ؟ اقرأ بكذا ، واقرأ بكذا .

''سیدنا جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز ادا کرتے ، پھر آ کر اپنی قوم کی امامت فرماتے تھے، ایک رات انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے عشاء کی نماز ادا کی ، پھر اپنی قوم کو آ کر یہی نماز پڑھائی اور سورۃ بقرہ کی قراءت شروع کی دی، ایک آدمی نے مڑ کر سلام پھیرا اور اکیلے اپنی نماز ادا کر کے لوٹ گیا، دوسرے صحابہ نے اسے کہا: کیا تو منافق ہو گیا ہے؟ اس نے جواباً کہا: اللہ کی قسم ایسا نہیں ہے، میں ضرور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر آپ کو یہ بات بتاؤں گا، چنانچہ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم سارا دن اونٹوں کے ذریعے کھیتوں کو پانی دیتے ہیں، معاذ نے آپ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی، پھر آ کر ہمارے پاس سورہ بقرہ شروع کر دی! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: اے معاذ! کیا تو دین سے متنفر کرتا ہے؟ تو فلاں فلاں سورت پڑھا کر۔''

(صحیح بخاری: ۹۷/۱ح: ۷۰۰ ،صحیح مسلم : ۱۸۷/۱ح: ٤٦٥ ، واللفظ له)

امام ترمذی (م ۲۷۹ھ) اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

هذا حديث حسن صحيح والعمل على هذا عند أصحابنا الشافعي وأحمد واسحاق ، قالوا : اذا أم الرجل القوم فى المكتوبة وقد كان صلاها قبل ذلك ، ان صلاة من ائتم به جائزة واحتجّوا بحديث جابر فى قصة معاذ وهو حديث صحيح ، وقد روى من غير وجه عن جابر .

''یہ حدیث حسن صحیح ہے، ہمارے ساتھیوں (محدثین) کا اسی پر عمل ہے، ان میں امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ شامل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جب ایسا آدمی فرضوں میں لوگوں کی امامت کرے، جو خود اس سے پہلے وہی نماز پڑھ چکا ہو، تو اس کی اقتدا کرنے والوں کی نماز جائز ہے، انہوں نے سیدنا معاذ کے قصہ والی جابر کی حدیث سے دلیل لی ہے اور یہ حدیث صحیح ہے، جابر سے اور بھی کئی سندوں سے یہ حدیث مروی ہے۔ (جامع ترمذی تحت حدیث : ۵۸۳)

اب اس حدیث پر محدثین کی تبویب بھی ملاحظہ فرمائیں:

امام ترمذی فرماتے ہیں: **باب ما جاء فی الذی یصلی الفریضة ثم یؤم الناس بعد ذلک .**

''ان روایات کا بیان جو اس شخص کے بارے میں آئی ہیں کہ جو فرض پڑھ لیتا ہے، پھر اس کے بعد لوگوں کو نماز پڑھاتا ہے۔''

امام الائمہ ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ) لکھتے ہیں: **باب اباحة ائتمام المصلّی فریضة بالمصلّی نافلة ، ضدّ قول من زعم من العراقیین أنه غیر جائز أن یأتم المصلّی فریضة بالمصلّی نافلة .**

''اس بات کا بیان کہ نفل پڑھنے والے کی اقتداء میں فرض پڑھنے والے کی نماز جائز ہے، بخلاف کوفیوں کے کہ ان کے خیال میں فرض پڑھنے والے کے لئے نفل پڑھنے والے کی اقتداء ناجائز ہے۔'' (صحیح ابن خزیمہ : ۳/۶٤، باب : ۱۳۰)

امام ابن حبان فرماتے ہیں:

ذکر الاباحة لمن صلّی جماعة فرضه أن یؤم قوما بتلک الصلوة .

''جو شخص باجماعت فرض پڑھ لے، تو اس کا اپنی قوم کو وہی نماز پڑھانا جائز ہے۔'' (صحیح ابن حبان : ٦/١٦٤، ح : ٢٤٠٢)

امام ابوداؤد (م ۲۷۵ھ) لکھتے ہیں:

باب امامة من صلّی بقوم وقد صلّی تلک الصلوة .

''اس شخص کی لوگوں کو امامت کا بیان جو وہی نماز پہلے پڑھ چکا ہو۔'' (سنن أبی داود، حدیث : ٥٩٩)

امام دارقطنی (م ۳۵۸ھ) کی تبویب یوں ہے:

باب ذکر صلاة المفترض خلف المتنفّل . (سنن دار قطنی : ۱/۲۸۱)

امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) ان احادیث پر یوں تبویب فرماتے ہیں: **باب الفریضة خلف من یصلّی النافلة .**

''نفل پڑھنے والے کی اقتداء میں فرض پڑھنے کا بیان۔'' (السنن الکبری للبیہقی : ۳/۸۵)

حافظ نووی (م ٦٧٦ھ) رقم طراز ہیں: **باب صحّة صلاة المفترض خلف المتنفّل .**

''اس بات کا بیان کہ متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز صحیح ہوتی ہے۔'' (خلاصة الاحکام از نوویؒ : ۲/٦٩٧)

امام نسائی کی تبویب یوں ہے: **باب اختلاف نیة الامام والمأموم .**

''امام اور مقتدی کی نیت مختلف ہونے کا بیان۔''

علامہ سندھی حنفی لکھتے ہیں: **یرید اقتداء المفترض بالمتنفّل .** ''امام نسائی کی مراد یہ ہے کہ متنفل (نفل پڑھنے والے) کے پیچھے مفترض (فرض پڑھنے والے) کی نماز۔'' (حاشیة السندی علی النسائی : ۲/۱۰۲)

محدثین اپنی روایات کو مقلدین سے بہتر جانتے ہیں۔

قارئین کرام! محدثین تو اس حدیث سے متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز کا جواز ثابت کر رہے ہیں، جیسا کہ ان کی تبویب سے عیاں ہے، امام ترمذی کا تبصرہ آپ پڑھ چکے ہیں، اب حافظ نووی کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیں:

فی هذا الحدیث جواز صلوة المفترض خلف المتنفّل لأن معاذا کان یصلّی الفریضة مع رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم فیسقط فرضه، ثمّ یصلّی مرّة ثانیة بقومه، هی له تطوّع ولهم فریضة، وقد جاء هٰکذا مصرّحا به فی غیر مسلم .

''اس حدیث میں متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز کا جواز موجود ہے، کیونکہ سیدنا معاذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فرض پڑھتے تو ان کا فریضہ ساقط ہو جاتا تھا، پھر دوسری دفعہ اپنی قوم کو پڑھاتے، یہ سیدنا معاذ کے لئے نفلی ہوتی اور قوم کے لئے فرضی، یہ بات صحیح مسلم کے علاوہ دوسری کتب میں صراحت سے موجود ہے۔''(شرح مسلم للنووی : ۱۸۷/۱)

حافظ بغوی لکھتے ہیں: وفیه جواز صلاة المفترض خلف المتنفّل ، لأن معاذا کان یؤدّی فرضه مع رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم ثمّ یرجع الٰی قومه فیؤمّهم ، هی له نافلة ولهم فریضة .

''اس حدیث میں نفل پڑھنے والے کی اقتدا میں فرض پڑھنے والے کی نماز کا جواز ثابت ہوتا ہے، کیونکہ معاذ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے فرض ادا کرتے، پھر اپنی قوم کے ہاں لوٹ کر ان کو نماز پڑھاتے، یہ ان کے لیے نفل اور قوم کے لیے فرضی ہوتی تھی۔''(شرح السنة للبغوی : ۷۳/۳)

حافظ ابن حزم (م ۴۵۶ھ) لکھتے ہیں: وجائز صلاة الفرض خلف المتنفّل، والمتنفّل خلف من یصلّی الفرض ، وصلاة فرض خلف من یصلّی صلاة فرض أخرٰی کل ذالک حسن وسنّة .

''فرضی نماز متنفل کے پیچھے، متنفل کی فرض پڑھنے والے کے پیچھے اور فرضی نماز پڑھنے والے کے پیچھے کوئی دوسری فرضی نماز جائز ہے، یہ تمام کام اچھے ہیں اور سنت ہیں۔''(المحلی لابن حزم : ۲۲۳/٤ ، مسئله : ٤٩٤)

موصوف مزید لکھتے ہیں:

ما نعلم لمن ذکرنا من الصّحابة رضی اللّٰه عنهم مخالفا أصلاً ، وهم یعظّمون هٰذا اذا وافق تقلیدهم ! و قولنا هٰذا قول الأوزاعیّ والشّافعیّ و أحمد بن حنبل وأبی سلیمان وجمهور أصحاب الحدیث .

''ہم نے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ذکر کئے ہیں، ان کا کوئی مخالف بالکل ہمارے علم میں نہیں، جب یہ بات (صحابہ کا اختلاف نہ ہونا) مقلدین کی تقلید کے موافق ہو، تو اسے بڑا بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں، جبکہ یہاں نظر نہیں آتی۔ جو ہمارا مذہب ہے، وہی امام اوزاعی، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، ابوسلیمان اور جمہور اہل حدیث (محدثین) کا مذہب ہے۔''(المحلی لابن حزم : ۲۳٦/٤)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: واستدلال بهذا الحدیث علٰی صحّة اقتداء المفترض باالمتنفّل بناء علٰی أن معاذا کان ینوی بالأولی الفرض وبالثانی النّفل .

''اس حدیث سے متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز صحیح ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، کیونکہ معاذ پہلی نماز میں فرضوں اور دوسری میں نفلوں کی نیت کرتے تھے۔(فتح الباری : ۱۹۵/۲)

گھر کی گواہی:

علامہ سندھی حنفی لکھتے ہیں:

فدلالة هذا الحديث علىٰ جواز اقتداء المفترض باالمتنفّل واضحة و الجواب عنه مشكل جدا و أجابوا بما لا يتمّ .

''یہ حدیث واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ متنفل کی اقتدا مفترض کے لئے جائز ہے،اس کا جواب بہت ہی مشکل ہے،احناف نے اس کے ناقص جوابات دیئے ہیں۔(حاشية السندى على النسائى : ۱۰۳/۲)

دیکھیں کہ احناف کے ایک بزرگ علامہ سندھی حنفی کتنے واشگاف الفاظ میں بتا رہے ہیں کہ اس حدیث سے اہلحدیث کا مسلک صاف طور پر واضح ہو رہا ہے اور اس کا جواب دینا مشکل ہے،لیکن اس کے باوجود بعض لوگوں نے اپنے آپ کو اس مشکل میں ڈال رکھا ہے اور طرح طرح کی تاویلات کا سہارا لیا ہے۔

احناف کی تنگدستی:

اس مسئلہ میں ان کی تنگ دستی کا یہ عالم ہے کہ ان کے پاس کوئی صحیح ،صریح اور مرفوع روایت تو در کنار،کوئی ضعیف و موضوع روایت بھی نہیں ، یہی وجہ ہے کہ جناب انوار خورشید صاحب نے اس مسئلہ کو''حدیث اور اہلحدیث'' میں پیش ہی نہیں کیا،اگر کوئی ضعیف وموضوع روایت بھی ہوتی تو وہ ضرور عنوان قائم کر دیتے،جیسا کہ ان کی ''روایت'' ہے،اس لئے ''میں نہ مانوں'' کے مصداق احناف نے محض صحیح احادیث کو تاویلات کا نشانہ بنانے پر اکتفا کیا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ابن ترکمانی حنفی جو کہ ذرا ذرا سی بات پر امام بیہقی کی تردید اور حدیث میں تاویل کرتے ہیں،حدیث معاذ پر وہ بھی چپ سادھ گئے ہیں،کوئی تاویل نہیں کی۔(دیکھیں الجوهر النقى : ۵۸/۳)

یہاں آلِ دیوبند کے''حکیم الامت'' جناب اشرف علی تھانوی دیوبندی کی عبارت قابل ذکر ہے،فرماتے ہیں:

''اکثر مقلدین عوام بلکہ خواص اس قدر جامد ہو جاتے ہیں کہ اگر قولِ مجتہد کے خلاف کوئی آیت یا حدیث کان میں پڑتی ہے،ان کے قلب میں انشراح وانبساط نہیں رہتا، بلکہ اول استنکار قلب میں پیدا ہوتا ہے پھر تاویل کی فکر ہوتی ہے خواہ کتنی ہی بعید ہو اور خواہ دوسری دلیل قوی اس کے معارض ہو بلکہ مجتہد کی دلیل اس مسئلہ میں بجز قیاس کے کچھ بھی نہ ہو بلکہ خود اپنے دل میں اس تاویل کی وقعت نہ ہو مگر نصرتِ مذہب کے لیے تاویل ضروری سمجھتے ہیں،دل یہ نہیں مانتا کہ قولِ مجتہد کو چھوڑ کر حدیث صحیح پر عمل کر لیں۔''(تذكرة الرشيد : ۱۳۱)

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

قارئین خود ہی غور فرمالیں کہ اس تھانوی فرمان کے بالکل مطابق جامد مقلدین محض ایک قیاس (کمزور پر قوی کی بناء) کی وجہ سے صحیح وصریح حدیث میں کتنی تاویلات کر رہے ہیں،لیکن ماننے کو تیار نہیں۔

<u>حدیثِ معاذ پر اعتراضات اور ان کے جوابات:</u>

اس حدیث کے علاوہ بھی کئی احادیث جن کا ذکر آئندہ آئے گا، اس مسئلہ پر صریح طور پر دلیل ہیں، لیکن ہم پہلے اس حدیث نبوی پر کیے گئے بودے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں، بقولِ حافظ ابن حزم:

واعترضوا فی حدیث معاذ بأشیاء نذکرھا ، وان کنا غانین عن ذالک بحدیث أبی بکرۃ و جابر، لکن نصر الحق فضیلۃ ، و قمع الباطل وسیلۃ الی اللّٰہ تعالٰی .

''احناف نے سیدنا معاذ کی حدیث پر بہت سے اعتراض وارد کئے ہیں، جن کا ہم ذکر کرنے والے ہیں، اگر چہ ابوبکرہ اور جابر رضی اللہ عنہما کی حدیث کی بنا پر ہم ان اعتراضات کے جوابات سے مستغنی ہیں، لیکن (صرف اس وجہ سے ایک ایک کا جواب دیں گے) کہ حق کی نصرت نیکی ہے اور باطل کا قلع قمع اللہ تعالی کے تقرب کا ذریعہ ہے۔''

(المحلی لابن حزم : ۲۲۹/٤)

اعتراض نمبر ۱:

مشہور مقلد جناب محمد سرفراز خاں صفدر دیوبندی حیاتی لکھتے ہیں:

''اس روایت کے کئی جواب ہیں تین امام طحاویؒ اور باقی دوسرے لوگوں نے دیے ہیں، جواب نمبر ۱:

امام طحاویؒ لکھتے ہیں: **لو ثبت أن معاذا فعلہ فی عھد رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم لم یکن فی ذالک دلیل علٰی أنہ بأمر رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم .... الخ**

یعنی یہ کاروائی حضرت معاذؓ کی اپنی رائے سے تھی، نبی علیہ السلام کا حکم نہ تھا۔'' (خزائن السنن : ۲۰۳/۲)

تبصرہ :

امام طحاوی کا اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ کام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں کیا تھا، تو بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوگا کہ انہوں نے ایسا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کیا، اس اعتراض کے کئی جوابات ہیں:

☆۱ یہ کہنا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بغیر سیدنا معاذ نے ایسا کیا، بلا دلیل ہونے کی وجہ سے باطل و مردود ہے، کیونکہ یہ بھی تو ثابت نہیں کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنی مرضی سے ایسا کیا اور ان کے پاس کوئی دلیل نہ تھی۔

☆۲ کسی کام کے جواز کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ضروری نہیں، بلکہ آپ کو علم ہو جانے بعد اس پر سکوت اختیار کرنا بھی جواز کی دلیل ہے، جسے اصطلاح میں تقریر کہا جاتا ہے۔

جناب ظفر احمد تھانوی دیوبندی لکھتے ہیں:

وعلی المستدلّ باثبات علم النّبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم بفعل معاذ .

''اس حدیث سے استدلال کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ ثابت کرے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا معاذ کے اس کام کو جانتے تھے۔'' (اعلاء السنن : ۱۳۵۹/۳)

جناب! یہ لیں، صحیح مسلم کی روایت میں واضح الفاظ ہیں:

وان معاذا صلّی معک العشاء ، ثمّ أتی فافتتح بسورۃ البقرۃ .

''(شکایت کرنے والے نے کہا اے اللہ کے نبی!) معاذ نے آپ کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کی، پھر ہمارے ہاں آ کر سورۃ بقرہ شروع کردی۔'' (صحیح مسلم : ٤٦٥)

یہ نص صریح ہے کہ نبی کو اس بات کا پتا چل گیا تھا کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے، اس کے باوجود آپ نے ان کو قراءت میں تخفیف کا حکم تو دیا، لیکن اس کام سے منع نہیں فرمایا۔

3☆ قبیلہ بنوسلمہ، جس کی مسجد میں معاذ رضی اللہ عنہ جا کر نماز پڑھاتے تھے، اس میں تیس بیعت عقبہ میں شامل ہونے والے صحابہ اور تینتالیس بدری صحابی موجود تھے، جیسا کہ حافظ ابن حزم نے ذکر کیا ہے، ان میں جابر بن عبداللہ، ان کے والد عبداللہ، کعب بن مالک، حباب بن منذر، عقبہ بن عامر اور معاذ و معوذ رضی اللہ عنہم موجود تھے، کیا ان سب کی موجودگی میں یہ کام ہو اور خلافِ سنت ہونے کے باوجود وہ اس پر اعتراض نہ کریں، بھلا یہ ممکن ہے؟ کبھی نہیں، بلکہ یہ تو صحابہ کا اجماع ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ کام درست تھا، کسی دوسرے صحابی کا اس پر انکار یا اس کا خلاف منقول نہیں۔

حافظ ابن حجر، حافظ ابن حزم سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولا یحفظ عن غیرھم من الصّحابۃ امتناع ذلک ، بل قال معھم الجواز عمر وابن عمر و ابو الدرداء وأنس وغیرھم .

''ان صحابہ کے خلاف دوسرے کسی صحابی سے اس کا منع ثابت نہیں، بلکہ ان کی موافقت میں عمر، ابن عمر، ابودرداء اور انس رضی اللہ عنہم وغیرہ سے اس کا جواز ثابت ہے۔'' (فتح الباری : ٢/١٩٦)

حافظ ابن حجر مزید لکھتے ہیں: **انھم لا یختلفون فی أن رأی الصّحابی اذا لم یخالفہ غیرہ حجۃ .**

''مقلدین اس بات میں ہم سے متفق ہیں کہ کسی صحابی کی رائے اس وقت حجت ہوتی ہے، جب دوسرا کوئی صحابی اس کی مخالفت نہ کرے اور یہاں بھی ایسا ہی ہے۔'' (فتح الباری : ٢/١٩٦)

اعتراض نمبر ٢:

رہا ''بذل الجمھود شرح أبی داؤد'' میں جناب خلیل احمد سہارنپوری دیوبندی کا اس جواب پر یہ اعتراض کہ صحابہ کرام کا سکوت معتبر نہیں، کیونکہ نبی نے معاذ رضی اللہ عنہ کو ڈانٹا اور فرمایا:

لا تکن فتّانا ، اما أن تصلّی معی ، وامّا أن تخفف علیٰ قومک . (مسند الامام احمد ٥/٧٤)

''اے معاذ! لوگوں کو تنفر نہ کر، یا تو میرے ساتھ نماز پڑھ یا قوم کو ہلکی نماز پڑھا۔'' (بحوالہ اعلاء السنن : ٣/١٣٦٠ - ١٣٦١)

تبصرہ:

١☆ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ باسندِ صحیح ثابت نہیں، کیونکہ معاذ بن رفاعہ کی لقاء ''رجل من بنی سلمۃ''

سے ثابت نہیں، نہ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ملاقات ہے۔
حافظ ابن حزم لکھتے ہیں:

ان ھذا خبر لایصحّ ، لأنّہ منقطع ، لأن معاذ بن رفاعۃ لم یدرک النّبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ، ولا أدرک ھذا الذی شکا الی رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم بمعاذ .

''یہ حدیث صحیح نہیں، کیونکہ اس میں انقطاع ہے، معاذ بن رفاعہ نے نہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ کو پایا ہے، اور نہ ہی اس شخص کو جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی تھی۔''(المحلی لابن حزم : ۲۳۰/٤)

حافظ مزی لکھتے ہیں: **عن رجل من بنی سلمۃ یقال لہ سلیم قصۃ معاذ بن جبل فی الصلوۃ مرسل .**

(تہذیب الکمال: ۱۷۱/۱۸)

حافظ ہیثمی بھی یہی کہتے ہیں۔(مجمع الزوائد:۷۳/۲)، نیز حافظ ابن حجر بھی رقم طراز ہیں:

و ھذا مرسل لأن معاذ بن رفاعۃ لم یدرکہ .

''یہ روایت مرسل ہے، کیونکہ معاذ بن رفاعہ نے اس (رجل من بنی سلمہ) کو نہیں پایا۔''(فتح الباری : ۱۹٤/۲)

لہٰذا اس سے استدلال باطل ہوا۔

۲☆ ان الفاظ کے معانی میں احتمال آ گیا ہے، اگرچہ ان الفاظ سے احناف کا مدّعا بہرصورت ثابت نہیں ہوتا، امام طحاوی نے اس سے دونوں میں سے ایک کام کی ممانعت مراد لی ہے، جبکہ حافظ ابن حزم اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے اس سے صرف ''تخفیف فی القراءۃ'' مراد لی ہے، لہٰذا ان محتمل اور غیر ثابت شدہ الفاظ کی وجہ سے محدثین اور ائمہ دین کی تصریح شدہ صریح و صحیح روایات کیسے چھوڑی جا سکتی ہیں؟

اعتراض نمبر ۳:

جناب محمد سرفراز خاں صفدر دیوبندی حدیث معاذ کے جواب نمبر۲ کے تحت لکھتے ہیں:

''امام طحاویؒ ہی ۱۹۹ج ا میں لکھتے ہیں: **فقد یجوز أن یکون یصلّی مع النّبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نافلۃ ثم یأتی قومہ فیصلّی بھم الفریضۃ .**

ہوسکتا ہے کہ معاذؓ نبی کے ساتھ نفل پڑھتے ہوں پھر اپنی قوم کے پاس آ کر انہیں فرض پڑھاتے ہوں۔''

(خزائن السنن : ۲۰٤/۲)

تبصرہ:

۱☆ احتمالی الفاظ سے استدلال جائز نہیں، کیونکہ صحیح مسلم کے الفاظ ہیں کہ شکایت کرنے والے نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر یوں شکایت کی تھی:

ان معاذا صلی معک العشاء ، ثم أتی فافتتح بسورۃ البقرۃ .....

''بے شک معاذ نے آپ کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کی، پھر آ کر سورۃ بقرہ کی قراءت شروع کر دی۔''

(صحیح مسلم : ٤٢٥)

لہٰذا مسلم کے صریح الفاظ سے ثابت ہو رہا ہے کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ فرض نبی کے اقتداء میں ادا کرتے تھے اور اپنی قوم کے ساتھ نفل ادا کرتے تھے۔

☆٢ امام ابن خزیمہ حدیثِ معاذ پر یوں تبویب فرماتے ہیں:

باب ذکر البیان أن معاذا کان یصلّی مع النّبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم فریضۃ لا تطوعا کما ادّعی بعض العراقین .

''اس بات کا بیان کہ معاذ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فرض پڑھتے تھے، نہ کہ نفل، جیسا کہ بعض عراقیوں (کوفیوں) نے دعوی کیا ہے۔'' (صحیح ابن خزیمہ : ٦٥/٣، باب : ١٣١)

☆٣ امام ابن حبان اسی حدیث پر یوں باب قائم فرماتے ہیں:

ذکر الخبر المدحض قول من زعم أن معاذا کان یصلی بالقوم فرضہ لا نفلہ .

''اس شخص کے قول کا رد کرنے والی روایت جو دعوی کرتا ہے کہ معاذ اپنی قوم کے ساتھ نفل نہیں، فرض پڑھتے تھے۔''

(صحیح ابن حبان : ١٦٣/٦)

☆٤ حافظ بغوی لکھتے ہیں: **لأن معاذا کان یؤدّی فرضہ مع رسول اللّٰہ .**

''کیونکہ سیدنا معاذ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے فرض ادا فرماتے تھے۔'' (شرح السنہ : ٧٣/٢)

محدثین اپنی روایات کو مقلدین سے تو بہتر جانتے ہیں۔

☆٥ سنن کبریٰ بیہقی وغیرہ میں سیدنا معاذ کی حدیث میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

فیصلّی بھم تلک الصّلاۃ ، ھی لہ نافلۃ ولھم فریضۃ.

''معاذ رضی اللہ عنہ اپنی قوم کو وہی نماز پڑھاتے، ان کے لئے یہ نفل ہوتی اور قوم کے لئے فرض۔''

(السنن الکبرٰی للبیہقی : ٨٦/٣، الأم للشافعی : ١٧٣/١، دار قطنی : ٢٧٤/١، شرح معانی الآثار للطحاوی : ٤٠٩/١، وسندہ صحیح)

ابن جریج جو بالاتفاق ثقہ امام ہیں، انہوں نے سماع کی تصریح کر رکھی ہے۔ دوسرے راویوں کی طرف سے ان الفاظ کا عدمِ ذکر عدمِ وجود پر دلالت نہیں کرتا، ثقہ کی ''زیادت'' بالاتفاق مقبول ہے، کیونکہ یہ ثقات کی مخالفت نہیں ہے۔

جناب نیموی حنفی نے آثار السنن میں ان الفاظ کو شاذ قرار دینے کی بڑی سعی کی ہے، حالانکہ وہ خود اسی کتاب میں کئی مقامات پر ثقہ کی ''زیادت'' کو قبول کر چکے ہیں، ایک مقام ملاحظہ ہو:

عبداللّٰہ بن الزبیر الحمیدی ثقۃ ، حافظ ، امام ، وھو أحد شیوخ البخاری ، فزیادتہ ھذہ تقبل جدّا ، لأنھا لیست منافیۃ لروایۃ من ھو أوثق منہ .

''عبداللہ بن زبیر حمیدی ثقہ، حافظ اور امام ہیں، نیز امام بخاری کے استاذ ہیں، لہٰذا ان کی زیادت ضرور قبول کی جائے گی، کیونکہ وہ ان سے اوثق کی روایت کے مخالف نہیں ہے۔''(دیکھیں آثار السنن : ص ۱۷ حاشیہ:۲۷)

جہاں اپنے مطلب کی بات تھی، وہاں نیموی صاحب نے یہ زیادت فوراً'' تقبل جدّا'' کہہ کر قبول کر لی، لیکن یہاں چونکہ ان کے خلاف تھی، لہٰذا ٹال مٹول سے کام لیا ہے۔

☆۶ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

صلاۃ فی مسجدی ھذا خیر من ألف صلاۃ فیما سواہ الا المسجد الحرام .

''میری اس مسجد میں ایک نماز، بیت اللہ کے علاوہ، ہر مسجد میں نماز سے ہزار گنا بہتر ہے۔''

(بخاری : ۱۱۹۰، مسلم : ۱۳۹٤)

اتفاقی طور پر اس نماز سے مراد فرضی نماز ہے، کیونکہ نفلی نماز تو بہر حال گھر میں افضل ہوتی ہے۔

کیا صحابیٔ رسول مسجد نبوی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک ہزار نماز کے ثواب کو ترک کر کے اپنی مسجد میں جا کر صرف ایک نماز کا ثواب حاصل کرتے تھے؟ یقیناً نہیں۔

حافظ ابن حزم مزید لکھتے ہیں:

فلیت شعری ، الی من کان یؤخّر معاذ صلاۃ فرضه حتّی یصلّیھا معه راغبا أن یصلّیھا مع رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم ؟ ألا ان ھذا ھو الضّلال المبین ، قد نزّہ اللّٰه تعالٰی معاذا عنه عند کل ذی مسکة عقل .

''افسوس ہے! معاذ رضی اللہ عنہ کس کے ساتھ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہو، فرضی نماز پڑھنے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسے ادا نہ فرماتے تھے؟ یہ واضح گمراہی ہے، ہر ذی عقل کے نزدیک اللہ تعالی نے سیدنا معاذ کو اس سے بچایا ہوا تھا۔''(المحلی : ٤/۲۳۱)

☆۷ کیا احناف کے نزدیک یہ جائز ہے کہ ایک آدمی جس نے عشاء کی نماز ابھی ادا نہ کی ہو، وہ امام کی فرضی نمازِ عشا کے پیچھے نفل کی نیت کر لے؟ جواب ہاں میں ہو ہی نہیں سکتا، بلاشبہ یہ درست نہیں، تو معاذ رضی اللہ عنہ کے ذمے ایسی غلط بات کیوں تھوپتے ہیں؟ فافھم و تدبر -

اعتراض نمبر ٤:

جناب ظفر احمد تھانوی دیوبندی لکھتے ہیں:

ولو سلّم أنھا زیادۃ ثقة فلا شک أنھا لیست من کلام رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم ولا من کلام معاذ ، وھذا ظاھر جدّا ، فیحتمل أن تکون من کلام ابن جریج أو من قول ابن دینار أو من قول جابر ، فمن أیّ ھؤلاء الثلاثة کان فلیس فیه دلیل علی حقیقة فعل معاذ ، لأنھم لم یحکوا ذلک عنه، انما قالوا قولا علٰی عندھم کذلک ، وقد یجوز أن یکون فی الحقیقة بخلافه ، کذا قاله العینی

نقلا عن الطّحاوی .

''اگر اسے ثقہ کی زیادت تسلیم کرلیا جائے تو بلا شبہ یہ الفاظ نہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور نہ ہی معاذ کے، یہ بات بالکل عیاں ہے، لہٰذا احتمال ہے کہ یہ ابن جریج کی کلام ہو یا ابن دینار یا جابر کا قول ہو، ان تینوں میں سے جس کے بھی یہ الفاظ ہوں، اس میں یہ دلیل نہیں کہ واقعۃً معاذ کا یہی فعل تھا، کیونکہ نہ الفاظ انہوں نے معاذ سے نقل نہیں کئے، بلکہ اپنے خیال میں جو بات تھی وہ کہہ دی کہ معاذ ایسا کرتے تھے، ہوسکتا ہے کہ حقیقت اس کے الٹ ہو، عینی نے امام طحاوی سے یہی بات نقل کی ہے۔'' (اعلاء السنن : ۱۳۵۹/۳ - ۱۳۶۰)

تبصرہ :

۱☆ احناف نے یہاں تک تو کہہ دیا ہے کہ ہوسکتا ہے یہ الفاظ جابر کے ہوں، لیکن ہم کہتے ہیں کہ احتمال نہیں بلکہ یقیناً یہ الفاظ صحابیٔ رسول سیدنا جابر کے ہی ہیں، ان کو احتمال کی وجہ سے مدرج قرار دینا اور ابن جریج یا ابن دینار کی طرف منسوب کرنا درست نہیں، کیونکہ ادراج کے لئے ٹھوس دلیل ہونا ضروری ہے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: الادرج لا یثبت بمجرد الدّعوی والاحتمال .

''ادراج محض دعوی یا احتمال سے ثابت نہیں ہوسکتا۔'' (فتح الباری : ۹۱/۲، ۹۶/۳)

۲☆ راوی اپنی روایت کو دوسروں سے بہتر جانتا ہے۔

جناب محمد سرفراز خاں صفدر حیاتی دیوبندی لکھتے ہیں:

''راویٔ حدیث خصوصا جبکہ صحابی ہو، اپنی مروی حدیث کی مراد کو دوسروں سے بہتر جانتا ہے۔''

(أحسن الکلام از صفدر : ۳۶۸/۱)

اسی طرح جناب عینی حنفی نے بھی یہی بات لکھی ہے (عمدۃ القاری: ۱۶/٤)

چنانچہ اگر یہ بات تسلیم بھی کرلی جائے کہ یہ الفاظ جابر نے محض اپنے فہم سے کہے، (حالانکہ ایسا نہیں ہے، کیونکہ جابر خود معاذ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے) تو کیا ہوا؟ اسی اصول کے تحت مقلدین کے احتمال پر صحابیٔ رسول کی رائے اور فہم کو ترجیح حاصل ہوگی۔ والحمد للہ

جناب ظفر احمد تھانوی دیوبندی لکھتے ہیں: فالموقوف عندنا حجة .

''موقوف روایت (قولِ صحابی) ہمارے نزدیک حجت ہے۔'' (اعلاء السنن : ۱۱۰۱/۳)

جب قولِ صحابی حجت ہے، تو یہاں کیوں نہیں مانتے؟ حالانکہ کسی صریح روایت یا دوسرے صحابی سے متعارض بھی نہیں۔

لطیفہ : جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی لکھتے ہیں: والوجدان یحکم بأنه مدرج ، لأن فی اسناده ابن جریج ومذهبه جواز اقتداء المفترض خلف المتنفل .

''میرا وجدان ان الفاظ کے مدرج ہونے کا فیصلہ دیتا ہے، کیونکہ اس روایت کی سند میں ابن جریج ہے اور اس کا مذہب متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز کے جواز کا ہے (لہٰذا اس نے اپنے مذہب کی تائید کے لئے الفاظ بڑھا دیے ہیں)۔''

(فیض الباری : ۲/۲۲۶ - ۲۲۷)

دیکھیں کہ دیوبندی صاحب کی کتنی جرأت ہے، انہوں نے حدیث میں اپنی تقلید کے خلاف آنے الفاظ کی تاویل کی خاطر بالاتفاق ثقہ راویوں پر بھی جرحی نشتر چلا دیئے کہ انہوں نے حدیث کو اپنے مذہب کے موافق بنانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ ذرا سا غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ حدیث کو بدلنے کی کوشش امام ابن جریج نے نہیں کی، بلکہ یہ مقلدین کا ہی حصہ ہے کہ صحیح احادیث کو بھی اپنی عقل اور وجدان کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیتے ہیں، بقول اشرف علی تھانوی صاحب جب کوئی آیت یا حدیث ان کے قول مجتہد کے خلاف آئے تو۔۔۔

نیز باقرار کشمیری صاحب ابن جریج کا یہی مذہب ہے، تو ہماری بات کو مزید تقویت مل گئی، کیونکہ مقلدین بھی مانتے ہیں کہ راوئ حدیث اپنی حدیث کو دوسروں سے بہتر جانتا ہے۔

اعتراض نمبر ۵:

جناب محمد سرفراز خاں صفدر دیوبندی حیاتی جواب نمبر ۳ کے تحت لکھتے ہیں:

''امام طحاوی ص ۱۹۹ ج ۱ میں لکھتے ہیں: **لا حتمل أن يكون ذلك من رسول الله صلّى الله عليه وسلّم في وقت مّا كانت الفريضة تصلّى مرّتين، فذلك قد كان يفعل في أول الاسلام حتّى نهى عنه النّبى صلّى الله عليه وسلّم .**

''احتمال ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہ اجازت اس وقت ہو، جب فرض دو مرتبہ پڑھائے جاتے تھے، کیونکہ شروع اسلام میں ایسا کیا جاتا تھا، پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا۔'' (خزائن السنن : ۲/۲۰۴)

تبصرہ:

۱......احناف مجبور ہو کر مان گئے ہیں کہ سیدنا معاذ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے فرض پڑھے تھے، لیکن اب ایک اور بلا دلیل دعوی کر دیا ہے۔

۲......صحابہ کرام ایک نماز کو فرض سمجھ کر دو مرتبہ ادا کرتے تھے، جھوٹا دعوی اور بہتان ہے، کیونکہ جو روایت طحاوی (۲۲۱/۱) کے حوالہ سے پیش کی جاتی ہے، وہ سخت ضعیف ہے۔ اس لیے کہ:

۱......قتادہ کی تدلیس موجود ہے، جناب عینی حنفی لکھتے ہیں: **انّ قتادة مدلّس لايحتجّ بعنعنته الّا اذا ثبت سماعه .**

''قتادہ مدلّس ہیں، ان کے عنعنہ سے حجت نہیں پکڑی جاسکتی، جب تک سماع کا ثبوت نہ ملے۔''

(عمدۃ القاری : ۲۶۱/۱)

۲...... خالد بن أیمن کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع ولقاء ثابت نہیں، مدعئ صحت پر دلیل لازم ہے، لہٰذا اس سے استدلال مردود ہے۔

رہا امام طحاوی کا ابن عمر کی مرفوع روایت: **ان رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نھٰی أن تصلّٰی فریضۃ فی یوم مرتین** (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فرض کو ایک ہی دن میں دو دفعہ ادا کرنے سے منع فرمایا۔) (ابو داؤد: ۵۷۹، نسائی: ۸٦۱، طحاوی: ۲۲۰ وغیرہ، وسندہ حسن) سے یہ استدلال کرنا کہ صحابہ کرام پہلے ایسا کرتے تھے، پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، کیونکہ **فالنھی لا تکون الا بعد الاباحۃ** . (نہی ہمیشہ جواز واباحت کے بعد ہی ہوتی ہے)، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ضروری تو نہیں کہ جس کام سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم منع فرمائیں، وہ پہلے جائز ہو اور صحابہ اسے کرتے ہوں، مثال کے طور پر: عبداللہ بن یزید الانصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

نھی النّبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم عن النّھبٰی و المثلۃ .

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاکہ ڈالنے اور مثلہ کرنے سے منع فرمایا۔'' (بخاری: ۵۵۱٦)

تو کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نہی سے پہلے اسلام میں ڈاکہ ڈالنا اور مثلہ کرنا جائز تھا اور صحابہ کرام ایسا کیا کرتے تھے؟ نعوذ باللہ! ڈاکہ اور مثلہ تو کسی دور میں بھی جائز نہیں رہا۔

لہٰذا جو شخص یہ دعوی کرتا ہے کہ شروع اسلام میں صحابہ کرام فرض دو مرتبہ پڑھتے تھے، اس پر صحیح وصریح دلیل پیش کرنا لازم ہے

اعتراض نمبر ٦:

جناب محمد سرفراز خاں صفدر دیوبندی حیاتی جواب نمبر ۴ کے تحت لکھتے ہیں:

''قاضی ابوبکر ابن العربیؒ عارضۃ الاحوذی ص ٦٦ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ حضرت معاذؓ دن کی نماز آپ کے ساتھ پڑھتے، پھر رات کی نماز قوم کو پڑھاتے، یعنی جو نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھتے وہ اور ہوتی اور جو قوم کو پڑھاتے وہ اور ہوتی۔'' (خزائن السنن: ۲/۲۰۴)

تبصرہ:

صفدر صاحب کی جانب سے یہ انتہائی فضول اعتراض ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں صریح الفاظ ہیں:

کان یصلّی مع رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم العشاء ، ثمّ ینصرف ، فیأتی قومہ فیصلّی بھم تلک الصّلوۃ .

''سیدنا معاذ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کرتے، پھر لوٹ کر اپنی قوم کو وہی نماز پڑھاتے۔

(صحیح مسلم: ٤٦٥)

قاضی ابن العربی المالکی نے اگر تسامحاً یہ بات کہہ بھی دی ہے، تو صفدر صاحب خود اسے خطا سمجھنے کے باوجود کیوں نقل کرتے ہیں؟ کیا صفدر صاحب ''ایمان'' سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ توجیہ معتبر ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے، تو صاف ظاہر ہے کہ تقلیدِ ناسدید اور احادیث نبوی کے انکار نے ان کو ایسے کام پر اکسایا ہے۔

اعتراض نمبر ٧:

جناب صفدر مزید لکھتے ہیں:

''بعض فقہاء احناف ؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ عبارت یوں ہے: فصلی لیلة مع النبی صلّی اللّٰه علیه وسلّم العشاء . (مسلم: ۱/۱۸۷) اس میں عشاء سے عشاء اُولی یعنی مغرب مراد ہے، جیسا کہ روایت ترمذی میں مغرب کی تصریح ہے اور ان معاذ بن جبل کان یصلّی مع رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم عشاء الآخرة ثمّ یرجع الٰی قومه فیصلّی بهم تلک الصّلوة. (مسلم: ۱/۱۸۷) اس میں عشاء سے عشاء مراد ہے، والمراد بتلک الصلوة مثلها فی طول القراء ة وغیرها ۔۔۔الخ (معارف: ۵/۱۰٤) نہ یہ کہ بعینہا وہی نماز ہے۔''

(خزائن السنن: ۲/۲۰٤ - ۲۰۵، مزید دیکھیں حاشیہ فیض الباری: ۲/۲۲۹)

تبصرہ :

قارئین! ذرا غور فرمائیں کہ تقلید نے مقلدین کو حدیث کے خلاف ایسے ایسے اعتراضات نقل کرنے پر مجبور کر دیا ہے، جو خود ان کے ہاں بھی مقبول نہیں، خود جناب صفدر صاحب پچھلے صفحہ پر با دلائل یہ ثابت کر آئے ہیں کہ حدیثِ معاذ میں لفظِ مغرب صحیح نہیں، معلول ہے، ذرا ان ہی کی زبانی یہ اعتراف ملاحظہ فرمائیں:

''**فائدہ** : لفظ مغرب معلول ہے، العرف الشذی: ۲۵۵ میں ہے: قال البیهقی فی معرفة السّنن والآثار: أنّ لفظ المغرب معلولة بتصریح العشاء فی سائر الروایات . (باقی روایات میں عشاء کی تصریح آ جانے کی وجہ سے لفظ مغرب معلول ہے) اور مبارکپوری ؒ تحفة الاحوذی: ۱/٤۰٤ میں لکھتے ہیں: وفی روایة مسلم (۱/۱۸۷) عشاء الآخرة (صحیح مسلم کی روایت میں عشاء الآخرۃ کے الفاظ ہیں) (خزائن السنن: ۲/۲۰۲)

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا!

صفدر صاحب سے سوال ہے کہ یہ ''فائدہ'' آخر ہے کس کیلئے ہے؟ اور صفدر صاحب کو اس ''فائدے'' نے ''فائدہ'' کیوں نہیں دیا؟ اس کو محض تعصب اور اندھی تقلید کا نام نہ دیا جائے، تو اور کیا کہا جائے؟

جب لفظِ مغرب ہی معلول ہو گیا تو مذکورہ بالا دعوی خود ہی مردود ہو گیا، رہی یہ بات کہ تلک الصلوة سے مراد وہی عشاء کی نماز نہیں، بلکہ مقدار قراءت وغیرہ میں اس کی مثل ہوتی تھی، تو یہ بے تکی کی انتہا ہے اور کج فہمی کی معراج ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ سیدنا معاذ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے عین مطابق نماز پڑھائیں، جتنی مقدار میں قراءت آپ کرتے تھے، اتنی ہی مقدار آپ قراءت کریں، پھر بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ڈانٹیں کہ:

أترید أن تکون فتّانا یا معاذ ؟ اذا أمّمت النّاس فاقرأ ﴿والشّمس وضحاها﴾ و ﴿سبّح اسم ربّک الأعلٰی﴾ و ﴿اقرأ باسم ربّک﴾ ﴿واللّیل اذا یغشٰی﴾ .

''اے معاذ! کیا تو دین سے متنفر کرنے والا بننا پسند کرتا ہے؟ جب تو لوگوں کی امامت کرے، تو (سورۃ بقرہ نہیں بلکہ) سورۃ الشمس، سورۃ الاعلی، سورۃ القلم اور سورۃ اللیل پڑھا کر۔'' (صحیح مسلم: ٤٦۵)

کیا خود آپ قراءت لمبی کر کے نماز پڑھاتے تھے اور معاذ کے اسی فعل کو فتنہ قرار دیتے تھے؟ یا للعجب ولضیعۃ الحدیث۔
ویسے بھی صحیح مسلم میں سیدنا معاذ کا عشاء الآخرۃ پڑھ کر اپنی قوم کو یہی نماز پڑھانا مذکور ہے، لہٰذا یہ تاویل باطل ہوئی۔

حافظ نووی حدیث معاذ رضی اللہ عنہ میں احناف کی تاویلات ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وکل ھٰذہ التّأویلات دعاوی لا أصل لھا فلا یترک ظاھر الحدیث بھا .

''یہ تمام تاویلات بے دلیل دعوے ہیں، ان کی بنا پر حدیث کے ظاہری مفہوم کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔''

(شرح مسلم از نووی : ۱۸۷/۱)

بفضل اللہ ہم نے حدیثِ معاذ پر آج تک وارد ہونے والے تمام اعتراضات و تاویلات کے جوابات دے دیے ہیں، اگر اب بھی کسی شخص کے ذہن میں کوئی اشکال یا تاویل ہو تو وہ اسے اپنے تئیں محدود نہ رکھے، بلکہ ہمیں ضرور مطلع کرے تا کہ اس کا بھی منصفانہ تجزیہ کیا جا سکے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں احادیثِ صحیحہ کے بے تکے جوابات دینے اور فضول تاویلات سوچتے رہنے کی بجائے ان پر عمل کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری زندگی دفاعِ حدیث کے لیے خاص کر دے اور اس عمل کو ہماری نجات کا ذریعہ بنا دے۔

آمین!

☆............☆............☆

اجماع معصوم دلیل ہے:

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

حافظ ابن الجوزی مشہور حنفی علی بن محمد الدامغانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس نے امام ابوحنیفہ، ابو یوسف اور محمد بن حسن شیبانی کے علاوہ کسی کی رائے کو فیصلہ کن ماننے سے انکار کر دیا ہے اور اپنی مجلس میں باآوازِ بلند یہ اعلان کر دیا ہے کہ اب دنیا میں کوئی مجتہد باقی نہیں رہا، اسے معلوم نہیں کہ اس کی اس بات میں کیا خرابی مضمر ہے، یعنی اجماع جو کہ شریعت کی ٹھوس ترین دلیل ہے، وہ اس سے انکاری ہو گیا ہے، حالانکہ ہمارے پاس اجماع کے سوا کوئی معصوم دلیل موجود نہیں، اللہ تعالیٰ نے اسے امتِ محمدیہ میں نبوت کا بدل قرار دیا ہے، کیونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تھے، آپ کے بعد تو کوئی نبی آنے سے رہا، لہٰذا اللہ نے اس امت کے اجماع کو اس کا قائم مقام کر دیا ہے۔'' (المنتظم لابن الجوزی : ۲۱۰/۹، ۵۱۳ھ)

تبرکات کی شرعی حیثیت:

غلام مصطفٰے ظہیر امن پوری

یہ نہایت اہم مسئلہ ہے، کیونکہ بسا اوقات اس کی وجہ سے توحید کے منافی اقوال وافعال سرزد ہو جاتے ہیں، اولیاء و صلحاء کی عبادت کا بنیادی سبب ان کی ذات، آثار اور قبور کو متبرک سمجھنا تھا، شروع میں انہوں نے ان کے جسموں کو تبرک کی نیت سے چھوا، پھر ان کو پکارنے لگے، ان سے مدد مانگنے لگے، پھر ان اولیاء سے کام آگے بڑھا تو مختلف جگہیں، جمادات اور اوقات کو متبرک سمجھے جانے لگے۔

دراصل تبرک کا معنٰی یہ ہے کہ اجر وثواب اور دین ودنیا میں اضافے کے لیے کسی مبارک ذات یا وقت سے برکت حاصل کرنا۔

محققین علماء کے نزدیک تبرک کی دو قسمیں ہیں:

۱......مشروع تبرک: جسے اللہ و رسول نے جائز قرار دیا ہو۔

۲......ممنوع تبرک: جو جائز تبرک میں شامل نہ ہو یا شارع نے اس سے منع فرمادیا ہو۔

ممنوع تبرک:

ممنوع تبرک شرک میں داخل ہے، اس کی دلیل یہ ہے:

سیدنا ابو واقد اللیثی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین کی طرف نکلے، اس وقت ہم نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، ایک بیری تھی، جس کے پاس مشرکین ٹھہرتے اور (تبرک کی غرض سے) اپنا اسلحہ اس کے ساتھ لٹکاتے، اسے ذاتِ انواط کہا جاتا تھا، ہم نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! جس طرح مشرکین کا ذاتِ انواط ہے، ہمارے لیے بھی کوئی ذاتِ انواط مقرر کر دیجیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ اکبر ، انها السنن ، قلتم ، والذی نفسی بیده ، کما قالت بنو اسرائیل لموسی : ﴿اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ﴾(الاعراف : ۱۳۸)لترکبن سنن من کان قبلکم .

''اللہ اکبر! اللہ کی قسم، یہ پرانا طریقہ ہے، تم نے اسی طرح کہا ہے، جس طرح بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ﴾(الاعراف : ۱۳۸) (ہمارے لیے بھی کوئی معبود بنا دیجیے، جس طرح ان (کافروں) کے معبود ہیں) ضرور تم اپنے سے پہلے لوگوں کے نقش قدم پر چلو گے۔''

(مسند الامام احمد : ۲۱۸/۵، جامع الترمذی : ۲۱۸۰، مسند الحمیدی : ۸۴۸، المعجم الکبیر للطبرانی : ۲۷۶/۳، صحیح)

امام ترمذی نے اس حدیث کو ''حسن صحیح'' اور امام ابن حبان (۶۷۰۲) نے ''صحیح'' کہا ہے۔

مشروع تبرک:

آیئے اب مشروع تبرک کے بارے میں جانتے ہیں:

عیسیٰ بن طہمان کہتے ہیں:

اخرج الینا انس رضی اللہ عنہ نعلین جرداوین ، لھما قبالان ، فحدثنی ثابت البنانی بعد عن انس انھما نعلا النبی صلی اللہ علیہ وسلم.

''سیدنا انس رضی اللہ عنہ ہمارے پاس بغیر بالوں کے چمڑے کے دو جوتے لائے ، ان کے دو تسمے تھے، اس کے بعد مجھے ثابت بنانی نے سیدنا انس کے واسطے سے بتایا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتے تھے۔''

(صحیح بخاری : ۴۳۸/۱، ح:۳۱۰۷)

ایک دفعہ سیدہ اسماء بنتِ ابی بکر رضی اللہ عنہا نے ایک سبز جبّہ نکالا اور فرمایا:

ھذہ کانت عند عائشۃ حتی قبضت ، فلما قبضت قبضتھا ، وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یلبسھا ، فنحن نغسلھا للمرضیٰ یستشفیٰ بھا .

''یہ سیدہ عائشہ کے پاس تھا، آپ فوت ہوئیں تو میں نے اپنے پاس رکھ لیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے زیبِ تن فرمایا کرتے تھے، ہم اسے بیماروں کے لیے شفا کی امید سے پانی میں ڈالتے ہیں۔'' (صحیح مسلم : ۲/ ۱۹۰، ح: ۲۰۶۹)

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے ایک پیالہ اپنے پاس رکھا ہوا تھا، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے پانی پیا تھا، ابو حازم کہتے ہیں کہ سہل نے اسے نکالا اور ہم نے اس میں پانی پیا، اس کے بعد امام عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے ان سے مانگا، انہوں نے ان کو تحفہ میں دے دیا۔ (صحیح بخاری : ۸۴۲/۲، ح: ۵۶۳۷)

عبیدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں، ہمارے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک تھے، جنہیں ہم نے سیدنا انس یا ان کے گھر والوں سے لیا تھا، کہتے ہیں، اگر میرے پاس آپ کا ایک بال ہو تو مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ پیارا ہے۔

(صحیح بخاری : ۲۹/۱، ح: ۱۷۰)

یاد رہے کہ یہ تبرک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا، اب کسی اور کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

حافظ شاطبی فرماتے ہیں:

ان الصحابۃ بعد موتہ لم یقع من أحد منھم شیء من ذلک بالنسبۃ الی من خلفہ ، اذ لم یترک النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعدہ فی الأمۃ أفضل من أبی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ ، فھو کان خلیفتہ ، ولم یفعل بہ شیء من ذلک ، ولا عمر رضی اللہ عنہ ، وھو کان أفضل الأمۃ بعدہ ، ثم کذلک عثمان ، ثم علی ، ثم سائر الصحابۃ الذین لا أحد أفضل منھم فی الأمۃ ، ثم لم یثبت لو أحد منھم من طریق صحیح معروف أنّ متبرکا تبرک بہ علی أحد تلک الوجوہ أو نحوھا ، بل اقتصروا فیھم علی الاقتداء بالأفعال والأقوال والسیر التی اتبعوا فیھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ، فھو اذا اجماع منھم علی ترک تلک الأشیاء.

''صحابہ کرام نے آپ کی وفات کے بعد آپ کے علاوہ کسی کے لیے یہ (تبرک) مقرر نہ کیا، کیونکہ آپ کے بعد

امت میں سب سے افضل سیدنا ابوبکر صدیق تھے، آپ کے بعد خلیفہ بھی تھے، ان کے ساتھ اس طرح کا کوئی معاملہ نہیں کیا گیا، نہ سیدنا عمر نے ہی ایسا کیا، وہ سیدنا ابوبکر کے بعد امت میں سب سے افضل تھے، پھر اسی طرح سیدنا عثمان و علی رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ کرام تھے، کسی سے بھی باسندِ صحیح ثابت نہیں کہ کسی نے ان کے بارے میں اس طرح سے کوئی تبرک والا سلسلہ جاری کیا ہو، بلکہ ان (صحابہ) کے بارے میں انہوں (دیگر صحابہ و تابعین) نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع پر مبنی اقوال و افعال اور طریقہ کار پر اکتفا کیا ہے، لہٰذا یہ ان کی طرف سے ترکِ تبرکات پر اجماع ہے۔''

(الاعتصام : ۲/۸-۹)

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تشد الرحل الا الی ثلاثة مساجد ، المسجد الحرام ، ومسجدی هذا، والمسجد الأقصیٰ.

''(تبرک کی نیت سے) سامان صرف ان تین مسجدوں کی طرف باندھا جائے گا، مسجدِ حرام، میری مسجد (مسجدِ نبوی) اور مسجدِ اقصیٰ۔'' (صحیح بخاری : ۱/۱۵۹، ح: ۱۱۸۹، صحیح مسلم : ۱/۲۴۷، ح: ۱۳۹۷)

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ان تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور جگہ کی طرف سامان باندھ کر جانے کی نذر مان لے تو اس پر نذر کا پورا کرنا ضروری نہ ہوگا، اس بات پر ائمہ دین کا اتفاق ہے۔ (مجموع الفتاوٰی : ۲۷/ ۶ ۱۸ مختصرا)

حصولِ برکت کی خاطر انبیاء و صلحاء کی قبروں کی زیارت کے لیے سفر بدعت ہے، صحابہ کرام و تابعین عظام نے ایسا نہیں کیا، نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا۔

امام ابراہیم نخعی تابعی فرماتے ہیں:

لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد ؛ المسجد الحرام ، مسجد الرسول ، وبیت المقدس.

''(برکت حاصل کرنے کی نیت سے) رختِ سفر صرف تین مسجدوں کی طرف باندھا جائے گا، مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی اور بیت المقدس۔'' (مصنف ابن ابی شیبة : ۴/۶۵، وسنده صحیح)

☆............☆............☆

معوذتین

ابوسعید

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

أمرنی رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم أن أقرا بالمعوذات دبر کلّ صلاة .

''رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ہر نماز کے بعد سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھنے کا حکم دیا۔''

(عمل الیوم واللیلة لابن السنی : ۱۲۳، وسنده صحیح واخرجه احمد (۴/ ۱۵۵) وسنده صحیح واخرجه ابو داؤد (۱۵۲۳) والنسائی (۱۳۳۷) واحمد (۴/۲۰۱) وسنده حسن، صححه ابن خزیمة (۷۵۵) وابن حبان (۲۳۴۷-الموارد) وقال الذهبی : هذا حسن غریب (میزان الاعتدال :۴/۴۳۳))

قارئین کے سوالات

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

روزوں کی قضائی

سوال: کیا رمضان میں کسی عذر کی بنا پر چھوڑے گئے روزوں کی قضائی رمضان کے فوراً بعد دینا ضروری ہے؟

جواب: رمضان کے چھوڑے گئے روزوں کی قضائی پے در پے مستحب تو ہے، ضروری نہیں، کیونکہ:

۱......فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) ''دوسرے دنوں کی گنتی ہے۔''

۲......سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں: كان يكون عليّ الصوم من رمضان فما أستطيع أن أقضيه إلاّ في شعبان. ''مجھ پر رمضان کے روزوں کی قضائی ہوتی، میں انہیں شعبان سے پہلے نہ رکھ سکتی تھی۔''

(صحیح بخاری:۱۹۵۰، صحیح مسلم:۱۱۴۶)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: ''اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رمضان کی قضاء کو مطلق طور پر مؤخر کرنا جائز ہے، خواہ عذر کی وجہ سے یا بغیر عذر کے۔'' (فتح الباری:۱۹۱/۴)

۳......سیدنا عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: لا يضرّك كيف قضيتها، إنّما هي عدّة من أيام أخر''

''تجھے کوئی نقصان نہیں، جیسے جی چاہے قضائی دے، صرف دوسرے دنوں کی گنتی (پوری کرنا ضروری) ہے۔''

(تغلیق التعلیق لابن حجر:۱۸۶/۳، وسندهٗ صحیح)

۴......امام عطاء بن أبی رباح رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، دونوں نے فرمایا: فرقه إذا أحصيته ۔''جب تو گنتی رکھے، تو وقفے میں کوئی حرج نہیں۔'' (سنن دارقطنی:۱۹۳/۲، وسندهٗ حسن)

۵......سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: يواترهٗ إن شاءَ

''چاہے، تو پے در پے رکھ لے۔'' (مصنف ابن ابی شیبہ:۳۴/۳، وسندهٗ صحیح)

۶......بکر بن عبداللہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

أنهٗ كان لا يرى به بأسا، ويقول: إنّما قال اللّٰه ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾

''آپ رضی اللہ عنہ وقفے یا تأخیر میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، اور فرماتے تھے، کہ اللہ تعالیٰ نے صرف دوسرے دنوں کی گنتی کا ذکر فرمایا ہے۔'' (السنن الکبریٰ للبیہقی:۲۵۸/۴، وسندهٗ صحیح)

۷......أبو عامر الہوزنی کہتے ہیں:

سمعت أبا عبيدة بن الجراح رضى اللّٰه عنه سئل عن قضاء رمضان فقال: إنّ اللّٰه لم يرخص لكم فى فطره وهو يريد أن يشق عليكم فى قضائه، فأحص العدة واصنع ماشئت.

''میں نے سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو سنا، آپ سے رمضان کی قضاء کے بارے پوچھا گیا، آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے روزہ چھوڑنے کی رخصت اس لیے نہیں دی کہ قضاء میں تم پر مشقت ڈال دے، آپ گنتی شمار کریں اور

جو چاہیں کریں۔'' (السنن الکبری للبیہقی: ٤/ ٢٥٨، سنن دار قطنی: ٢/ ١٩١، وسندہٗ حسن)

٨......سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: **فرق قضاء رمضان، وأحص العدّة.**

''رمضان کی قضاء کو وقفے سے پورا کرلو، لیکن گنتی شمار کرو۔'' (سنن دار قطنی: ٢/ ١٩٢، وسندہٗ حسن)

٩......امام حکم بن عتیبہ رحمہ اللہ وقفے سے قضاء رمضان میں کوئی حرج خیال نہیں کرتے تھے۔

(ابن ابی شیبہ: ٣/ ٣٣، وسندہٗ صحیح)

١٠......جعفر بن میمون کہتے ہیں:

قضاء رمضان عدّة من أيام أخر. ''قضاء رمضان میں صرف دوسرے دنوں کی گنتی (پوری کرنا) ضروری ہے۔'' (ابن ابی شیبہ: ٣/ ٣٣، وسندہٗ صحیح)

فوری قضائی کے قائلین کے دلائل

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قضائے رمضان کے بارے میں فرماتے ہیں:

يتابع بينه. ''اس میں پے در پے روزہ رکھا جائے گا۔'' (مصنف ابن أبی شیبہ: ٣/ ٣٤، وسندہٗ صحیح)

عروہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **يواتر قضاء رمضان.** ''رمضان کے روزوں کی قضاء لگاتار دے گا۔''

(مصنف ابن ابی شیبہ: ٣/ ٣٤، وسندہٗ صحیح)

سعید بن مسیّب فرماتے ہیں: **يقضيه كهيأته.**

''جس طرح چھوڑے تھے، اسی طرح قضائی دے گا۔'' (مصنف ابن ابی شیبہ: ٣/ ٣٤، وسندہٗ صحیح)

محمد بن سیرین کہتے ہیں: **أحب إلیّ أن يصومه كما أفطره.**

''مجھے محبوب یہی ہے کہ جس طرح روزے چھوڑے تھے، اسی طرح قضائی دے۔'' (ابن أبی شیبہ: ٣/ ٣٤، وسندہٗ صحیح)

حکم بن عتیبہ کہتے ہیں: ''لگاتار قضائی دینا مجھے پسند ہے۔'' (ابن ابی شیبہ: ٣/ ٣٤، وسندہٗ صحیح)

قاسم بن محمد کہتے ہیں: **صمه متتابعا، إلا أن يقطع بك كما قطع بك فيه.**

''لگاتار روزے رکھ، الا یہ کہ (قضائی میں بھی) وہی عارضہ پیش آجائے، جو پہلے پیش آیا تھا۔''

(ابن ابی شیبہ: ٣/ ٣٤، وسندہٗ صحیح)

ان سب اقوال کو استحباب پر محمول کیا جائے گا، جیسا کہ امام عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں:

يقضيه متتابعاً أحبّ إلیّ وإن فرق أجزأه.

''رمضان کی قضائی لگاتار ہو، تو مجھے محبوب ہے، اگر وقفہ آجائے، تو کفایت کر جائے گی۔''

(مصنف ابن أبی شیبہ: ٣/ ٣٥، وسندہٗ صحیح)

روزوں کی قضائی پے در پے مستحب ہے، ضروری نہیں، جو لوگ لگاتار قضائی کو ضروری قرار دیتے ہیں، ان کے پاس نہ تو کوئی دلیل ہے، نہ سلف صالحین میں سے ان کا کوئی حامی ہے۔

نقد و تحقیق

کیا قہقہہ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ؟

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

اگر کوئی نماز میں ہنس پڑے تو نماز ہی ٹوٹے گی، وضو نہیں ٹوٹے گا، کیونکہ:

دلیل نمبر ۱: حافظ ابن المنذر (م: ۳۱۸ھ) لکھتے ہیں:

أجمع أهل العلم على أن الضحک فی غير الصلاة لا ينقض الطهارة ولا يوجب وضوءا وأجمعوا على أن الضحک فی الصلاة ينقض الصلاة .

''اس بات پر اہل علم کا اجماع و اتفاق ہے کہ نماز کے علاوہ ہنسنا وضو کو نہیں توڑتا، نہ ہی وضو کو واجب کرتا ہے، اس بات پر بھی اجماع ہے کہ نماز میں ہنسنا نماز کو توڑ دیتا ہے۔'' (الاوسط لابن المنذر : ۲۲٦/۱)

دلیل نمبر ۲: عن عطاء عن جابر قال: كان لا يرى على الذی يضحک فی الصلاة وضوءا.

''عطاء بن ابی رباح بیان کرتے ہیں کہ (صحابی رسول) سیدنا جابر (بن عبداللہ الانصاری) رضی اللہ عنہ نماز میں ہنسنے والے پر وضو خیال نہیں کرتے تھے۔'' (سنن الدارقطنی : ۱۷٤/۱، ح: ٦٥٠، وسنده حسن)

دلیل نمبر ۳:

''ہشام کہتے ہیں کہ میرے بھائی نماز میں ہنس پڑے، ان کو عروہ نے نماز دہرانے کا کہا، وضو کرنے کا نہیں کہا۔''

(مصنف ابن ابی شیبہ : ۳۸۷/۱، وسنده صحیح)

دلیل نمبر ٤: عن عطاء فی الرجل يضحک فی الصلاة ، قال: ان تبسم فلا ينصرف ، وان قهقه استقبل الصلاة ، وليس عليه وضوء .

''امام عطاء بن ابی رباح نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا، جو نماز میں ہنس پڑے، اگر اس نے تبسم ظاہر کیا، تو نماز نہیں توڑے گا، لیکن اگر قہقہہ لگا کر ہنسا تو نماز دہرائے گا، البتہ اس پر وضو نہیں ہے۔''

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۸۷/۱، وسنده صحیح)

دلیل نمبر ۵: عبدالرحمٰن بن قاسم کہتے ہیں: ضحكت وأنا أصلی مع أبی ، فأمرنی أن أعيد الصلاة

''میں اپنے والد صاحب کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ ہنس پڑا، انہوں نے مجھے نماز دہرانے کا حکم دیا۔''

(مصنف ابن ابی شیبہ : ۳۸۷/۱، وسنده صحیح)

دلیل نمبر ٦: محمد بن سیرین تابعی کہتے ہیں: كانوا يأمروننا ونحن صبيان ، اذا ضحكنا فی الصلاة أن نعيد الصلاة .

''بچپن میں جب ہم نماز میں ہنس پڑتے تو (علماء) ہمیں نماز دہرانے کا حکم دیتے تھے۔''

(مصنف ابن ابی شیبہ : ۳۸۸/۱، وسنده صحیح)

امام احمد بن حنبل (مسائل احمد لابن ھانی: ۷/۱)، امام شافعی (الام للشافعی: ۳۱/۱)، امام اسحاق بن راہویہ

(مسائل احمد و اسحاق:۱/ ۲۰) کا بھی یہی فتوی ہے۔

امام ابوبکر ابن ابی شیبہ فرماتے ہیں: **يعيد الصلاة و لا يعيد الوضوء.**

''نماز میں ہنسنے والا نماز تو دہرائے گا، لیکن وضو نہیں دہرائے گا۔'' (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۳۸۸)

تقلید پرست جمہورِ امت اور سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں کہتے ہیں کہ اگر کوئی نماز میں ہنس پڑے تو اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے، وہ اس کو وضو لوٹانے کا حکم دیتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس اس بارے میں کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔

ہم انتہائی اختصار کے ساتھ ان کے دلائل کا محدثین کرام کے اصولوں کے مطابق جائزہ پیش کرتے ہیں:

دلیل نمبر ۱: سیدنا ابوموسیٰ اشعری نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور مسجد میں واقع ایک گڑھے میں گر گیا، اس کی بصارت میں نقص تھا، بہت سارے لوگ نماز میں ہنس پڑے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص ہنسا ہے، وہ وضو بھی دوبارہ کرے گا اور نماز دہرائے گا۔

(المعجم الكبير للطبراني: ١/٢٤٦، نصب الراية: ١/٤٧)

تبصرہ: اس کی سند ''ضعیف'' ہے، اس میں ہشام بن حسان ''مدلس'' ہیں، جو ''عن'' سے روایت کر رہے ہیں، ثقہ مدلس کی صحیح بخاری و مسلم کے علاوہ ''عن'' والی روایت ''ضعیف'' ہوتی ہے۔

دلیل نمبر ۲: ابوالعالیہ الریاحی نے کہا کہ ایک اندھا کنویں میں گر گیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو نماز پڑھا رہے تھے، آپ کے ساتھ نماز پڑھنے والے کچھ لوگ ہنس پڑے، تو آپ نے فرمایا، جو ہنسا ہے، وہ وضو بھی دوبارہ کرے اور نماز بھی دہرائے۔'' (مصنف عبد الرزاق: ۲/۳۷۶، ح: ۳۷۶۰، ۳۷۶۲)

تبصرہ: اس کی سند ''تدلیس'' اور ''انقطاع'' کی وجہ سے ''ضعیف'' ہے۔ امام ابن المنذر فرماتے ہیں:

حديث أبي العالية مرسل ، و المرسل لا تقوم به الحجة .

''ابوالعالیہ کی حدیث مرسل ہے اور مرسل حدیث سے حجت قائم نہیں ہو سکتی۔'' (الاوسط: ۱/۲۲۸)

یاد رہے کہ دین متصل، صحیح روایات کا نام ہے۔

دلیل نمبر ۳: حسن بصری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک نابینا آدمی قبلہ کی جانب سے نماز کے ارادہ سے آیا، لوگ فجر کی نماز میں مشغول تھے، یہ نابینا ایک گڑھے میں گر گیا، کچھ لوگ ہنس پڑے، حتی کہ انہوں نے قہقہہ لگا دیا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا، جس نے قہقہہ لگایا ہے، وہ وضو اور نماز دونوں کو دہرائے۔'' (کتاب الآثار بروایۃ محمد: ۳۳)

تبصرہ: یہ موضوع (من گھڑت) حدیث ہے، کیونکہ:

۱...... یہ مرسل ہے اور مرسل روایت ''ضعیف'' ہوتی ہے۔

۲...... راوئ کتاب محمد بن حسن الشیبانی ''کذاب'' ہے۔

۳......اس میں محمد بن حسن الشیبانی کا استاذ بالاتفاق ''ضعیف ومتروک'' ہے، کسی ''ثقہ'' امام سے اس کا ''ثقہ'' ہونا باسندِ ''صحیح'' ثابت نہیں۔

دلیل نمبر ٤: معبد سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے میں مشغول تھے کہ ایک نابینا آدمی نماز کے ارادے سے آیا اور ایک گڑھے میں گر گیا، کچھ لوگ ہنس پڑے، حتی کہ انہوں نے قہقہہ لگا دیا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا، جس نے قہقہہ لگایا ہے، وہ وضو اور نماز دونوں کو دہرائے۔ (سنن الدارقطنی : ١٦٦/١، ح: ٦١٢)

تبصرہ: یہ روایت سخت ترین ''ضعیف'' ہے، کیونکہ:

ا......اس میں ''ارسال'' ہے، معبد الجہنی تابعی ہیں، خود امام دارقطنی نے اس کو ''مرسل'' کہا ہے، جناب زیلعی حنفی نے بھی اس کو ''مرسل'' قرار دیا ہے۔ (نصب الرایۃ : ٥١/١)

۲......اس میں امام حسن بصری کی تدلیس ہے۔

۳......اس کی سند کا دارومدار نعمان بن ثابت پر ہے، جو بالاجماع ''مجروح'' ہیں۔

دلیل نمبر ٥: سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس نے نماز میں قہقہہ لگایا، وہ وضو اور نماز دہرائے۔ (الکامل لابن عدی : ١٦٧/٢)

تبصرہ: یہ روایت بھی ''ضعیف'' ہے، کیونکہ اس میں ''انقطاع'' ہے، امام عطاء بن ابی رباح کا سیدنا ابن عمر سے سماع ثابت نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: **قد رآی ابن عمر ولم یسمع منه**۔

''یقیناً انہوں نے سیدنا ابن عمر کو دیکھا ہے، لیکن ان سے سماع نہیں کیا۔'' (المراسیل لابن أبی حاتم:١٥٤)

یہی بات امام علی بن مدینیؒ اور امام ابوعبداللہ نے بھی فرمائی ہے۔ (تہذیب التہذیب: ١٨٢/٧)

نیز اس میں بقیہ بن ولید راوی اگرچہ جمہور کے نزدیک ''ثقہ'' ہیں (دیکھیں :الترغیب والترھیب للمنذری: ٥٦٨/٤، الکاشف للذھبی: ١٠٦/١-١٠٧)، لیکن ''تدلیسِ تسویہ'' کے مرتکب تھے، لہٰذا سند مسلسل بالسماع ہونی چاہیے۔

حافظ ابن حجر ایک دوسری روایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

بقیة صدوق، لکنه یدلس ویسوی ، قد عنعنه عن شیخه وشیخ شیخه .

''بقیہ صدوق راوی ہے، لیکن تدلیس تسویہ کرتا تھا، اس نے اپنے استاذ اور استاذ کے استاذ سے بصیغۂ عن روایت کی ہے۔'' (موافقة الخبر الخبر لابن حجر: ٢٧٦/١)

حافظ ابن ملقن لکھتے ہیں: **لکن بقیة رمی بتدلیس التسویة ، فلا ینفعه تصریحه بالتحدیث**

''بقیہ پر تدلیس تسویہ کا الزام ہے، لہٰذا صرف اپنے شیخ سے سماع کی تصریح چنداں مفید نہیں۔''

(البدر المنیر: ٥٠٩/٤)

اس روایت کے ''ضعیف'' ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے، امام ابن عدی اسے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ومحمد الخزاعی هذا هو من مجهولی مشایخ بقیة ، ویقال عن بقیة فی هذه الحدیث عن محمد بن راشد عن الحسن ، ومحمد بن راشد أیضا عن الحسن مجهول .

''اس روایت میں موجود محمد الخزاعی ، بقیہ کے مجہول اساتذہ میں سے ہے، اس سند میں محمد بن راشد عن الحسن بھی بیان کیا جاتا ہے اور حسن بصری سے بیان کرنے والا محمد بن راشد بھی مجہول ہے۔'' (الکامل: ۳/۱٦٦-۱٦۷)

حافظ ابن حجر (لسان المیزان: ۵/۱٦۳) اور حافظ ذہبی (میزان الاعتدال : ۳/۵٤٤، المغنی : ۲/۲۹۷) نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

جناب ابن ترکمانی حنفی لکھتے ہیں: **ابن راشد هذا وثقه ابن حنبل و ابن معین**....(الجوهر النقی: ۱/۱٤٦)

ہم کہتے ہیں کہ جناب ابن ترکمانی حنفی صاحب شدید وہم واختلاط کا شکار ہو گئے ہیں، محمد الخزاعی ''مجہول'' کو محمد بن راشد المکحولی سمجھ بیٹھے ہیں، ایک ''ثقہ'' راوی کی ''توثیق'' ایک ''مجہول'' پر تھوپ دی ہے، ابن ترکمانی کی تقلیدِ ناسدید میں جناب ظفر احمد تھانوی دیوبندی کا اسے محمد بن راشد المکحولی کہہ کر اس روایت کو ''حسن'' قرار دینا مبنی بر جہالت ہے، کیونکہ محمد بن راشد المکحولی کے اساتذہ میں کسی محدث نے بھی حسن بصری کو ذکر نہیں کیا، نہ ہی حسن بصری کے شاگردوں میں ان کا نام موجود ہے، اس لیے حافظ ذہبی نے لکھا ہے:

محمد بن راشد عن الحسن نکرۃ . ''حسن بصری سے بیان کرنے والا محمد بن راشد مجہول ہے۔''

(المغنی : ۲/۲۹۷، میزان الاعتدال: ۳/۵٤٤)

ثابت ہوا کہ اس روایت میں محمد الخزاعی سے مراد محمد بن راشد المکحولی نہیں ، بلکہ اور کوئی ہے، جس کے حالات نہیں مل سکے۔ ہماری بات کی تصدیق کے لیے صرف محمد بن راشد المکحولی کا حسن بصری سے سماع نہ ملنا ہی کافی تھا، محدثین کی تصریح مزید سونے پر سہاگہ ہے۔

دلیل نمبر ٦ : عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا قهقه أعاد الوضوء و الصلاۃ . ''جب کوئی (نماز میں) قہقہہ لگائے، وہ وضو اور نماز کا اعادہ کرے۔''

(الکامل لابن عدی: ۳/۱٦۷)

تبصرہ: یہ سند ''موضوع'' (من گھڑت) ہے۔ کیونکہ:

ا......اس میں عمرو بن عبید راوی ''متروک وکذاب'' اور ''داعی الی البدعۃ'' ہے، یونس بن عبید کہتے ہیں:

کان عمرو بن عبید یکذب فی الحدیث . یعنی: ''عمرو بن عبید حدیث میں جھوٹ بولتا تھا۔''

(الجرح والتعدیل:٦/۲٤٦)

ابو حاتم کہتے ہیں کہ ''متروک الحدیث'' ہے۔ (الجرح والتعدیل : ٦/۲٤۷)

حمید کہتے ہیں: **لا تاخذ عن هذا شیئا ، فانه یکذب علی الحسن** .

''اس سے کچھ روایت نہ کرو، کیونکہ یہ حسن بصری پر جھوٹ باندھتا ہے۔'' (الجرح والتعدیل :٦/۲٤٦، وسنده حسن)

عمرو بن علی کہتے ہیں: **کان متروک الحدیث، صاحب بدعة** . (الجرح والتعدیل : ٦/۲٤۷، وسنده صحیح)

نعیم بن حماد کہتے ہیں کہ میں نے امام عبداللہ بن مبارک سے پوچھا کہ محدثین کرام نے عمرو بن عبید کو کس بنا پر ''متروک'' قرار دیا ہے؟ فرمایا، یہ بدعت کا داعی ہے۔(الجرح والتعدیل: ٦/٢٤٧، وسندہ حسن)

٢......اس کا دوسرا راوی عمر بن قیس المکی بھی ''متروک'' ہے۔

٣......اس میں حسن بصری کی ''تدلیس'' بھی ہے۔

دلیل نمبر ٧: عامر شعبی کہتے ہیں: ''یہ قہقہہ فتنہ ہے، ایسا انسان وضو اور نماز کا اعادہ کرے گا۔''

(مصنف ابن ابی شیبہ: ١/٣٨٨)

تبصرہ: اس کی سند ''ضعیف'' ہے، اس میں اشعث بن سوار نامی راوی ''ضعیف'' ہے۔(تقریب التہذیب: ٥٢٧)

امام مسلم نے اس سے متابعت میں روایت لی ہے، اس میں ابو خالد الاحمر ''مدلس'' بھی موجود ہے۔

دلیل نمبر ٨: ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ جب آدمی نماز میں ہنس پڑے تو وہ وضو اور نماز دونوں کا اعادہ کرے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ: ١/٣٨٨)

تبصرہ: اس میں مغیرہ نامی راوی کا تعین مطلوب ہے، دوسری بات یہ ہے کہ یہ ابراہیم نخعی کا قول ہے، نہ قرآن ہے، نہ حدیث ہے، نہ اجماعِ امت ہے، آلِ تقلید امام ابراہیم نخعی کے مقلد یا امام ابوحنیفہ کے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ نماز میں ہنسنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، باطل، بلکہ ابطل الاباطیل ہے، ایک باوضو انسان کا وضو اس وقت ٹوٹے گا، جب سنت یا اجماع سے دلیل قائم ہو جائے گی۔

ہنسنا یا قہقہہ لگانا ان چیزوں میں سے نہیں، جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، مثلاً، چھوٹی یا بڑی قضائے حاجت، نیند، ریح وغیرہ، ان چیزوں کے نماز کے اندر واقع ہونے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے اور نماز کے باہر بھی، لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نماز کے اندر ہنسنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، ان کے نزدیک نماز کے علاوہ ہنسنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، یہ عجیب منطق ہے!

آلِ تقلید یہ کہتے ہیں کہ اگر حالتِ نماز میں ہوا خارج ہو گئی تو وضو ٹوٹ جائے گا، نمازی دوبارہ وضو کرے، جو نماز پڑھ چکا ہو، اس پر بنیاد کرتے ہوئے باقی ادا کر لے، اگر درمیان میں کلام نہیں کی تو نماز فاسد نہیں ہوگی، اگر کلام کر لی تو نماز فاسد ہو جائے گی، از سرِ نو نماز ادا کرنا ضروری ہوگا، وہی کہتے ہیں کہ اگر دورانِ نماز ہنسی آ جائے تو وضو اور نماز دونوں کا اعادہ ضروری ہوگا، معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک نماز میں ہنسنا ہوا خارج کرنے سے بھی بڑا کام ہے۔

جناب عبدالشکور لکھنوی فاروقی دیوبندی لکھتے ہیں:

''نابالغ کے قہقہے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اگرچہ نماز میں ہی ہو۔''(علم الفقہ از لکھنوی: ٩٦)

نیز لکھتے ہیں:

''جنازہ کی نماز اور تلاوت کے سجدہ میں قہقہہ لگانے سے وضو نہیں جاتا، بالغ ہو یا نابالغ۔''(علم الفقہ: ٩٦)

جبکہ یہ فرق شریعتِ مطہرہ سے ثابت نہیں، محض ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ دیکھیں کہ یہ لوگ کس طرح اسلام کے نظامِ نظافت وطہارت کا سنگین مذاق اڑاتے ہیں!

یاد رہے کہ وضو ایمان میں داخل ہے، یہ بات بھی واضح ہو کہ لکھنوی صاحب نے اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''ہر مسئلہ میں وہی قول لکھا جائے گا، جس پر فتویٰ ہے۔'' (علم الفقه: ١٥)

تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ یہی لوگ کہتے ہیں کہ اگر نماز کے آخر میں سلام پھیرنے سے پہلے اتنی دیر بیٹھا، جتنی دیر میں تشہد پڑھا جا سکتا ہے، پھر جان بوجھ کر ہوا خارج کر دے یا قہقہہ لگا دے یا ہنس دے یا نماز کے منافی کوئی کام کر دے تو نماز مکمل ہو گئی۔ فیا للعجب!

اس سے بڑھ کر حیرانی اس بات پر ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نماز میں ہنسنے سے وضو اور نماز دونوں ٹوٹ جاتے ہیں، ان کے نزدیک اگر نماز میں کسی پر تہمت لگائی یا فحش کلام کر دی تو وضو نہیں ٹوٹے گا، مطلب صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک نماز میں ہنسنا کسی پر تہمت لگانے سے بھی بڑا جرم ہے۔

اس پر ایک مناظرہ کی روئیداد ملاحظہ فرمائیں:

البویطی یقول : سمعت الشافعی یقول : قال لی الربیع : أنا أشتهی أن أسمع مناظرتک و اللؤلوی ، قال: فقلت له : لیس هناک ، قال: فقال: أنا أشتهی ذلک ، قال : فقلت : متی شئت ، قال : فأرسل الی فحضرنی رجل ممن کان یقول بقولهم ، ثم رجع الی قولی ، فاستتبته وأرسل الی اللؤلوی ، فجاء ، فأتینا بطعام ، فأکلنا ولم یأکل اللؤلوی ، فلما غسلنا أیدینا قال له الرجل الذی کان معی : ما تقول فی الرجل قذف محصنة فی الصلاة ؟ قال : بطلت صلاته ، قال: فما حال الطهارة ؟ قال : بحالها ، قال : فقال له : فما تقول فی من ضحک فی الصلاة ؟ قال : بطلت صلاته و طهارته ، قال : فقلت : قذف المحصنات فی الصلاة أیسر من الضحک فی الصلاة ؟ قال : فأخذ اللؤلوی نعله وقام ، قال : فقلت للفضل : قد قلت لک : انه لیس هناک.

''بویطی کہتے ہیں کہ میں نے امام (محمد بن ادریس) الشافعی کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھے فضل بن ربیع (یہ امیر المومنین ہارون الرشید کے دربان تھے) نے کہا، میں آپ کے اور (حسن بن زیاد) اللولوی (کذاب حنفی فقیہ) کے مابین مناظرہ سننا چاہتا ہوں، میں نے کہا، وہ اس قابل نہیں، اس نے کہا کہ میں کرانا چاہتا ہوں، امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے کہا، آپ کب مناظرہ کرانا چاہتے ہیں؟ پھر اس (فضل بن ربیع) نے (مناظرے کے لیے) مجھے بلوالیا، اسی اثنا میں ایک آدمی میرے پاس آیا جو پہلے اللولوی کا معتقد تھا، بعد میں اس نے میرا مسلک اختیار کر لیا تھا، میں نے اسے بھی اپنے ساتھ لے لیا، اس (فضل بن ربیع) نے اللولوی کو بھی بلایا، وہ آ گیا، ہمارا کھانا لایا گیا، ہم سب نے کھانا کھایا، لیکن اللولوی نے نہیں کھایا، جب ہم ہاتھ دھو رہے تھے تو میرے ایک ساتھی نے اللولوی سے پوچھا کہ آپ ایسے انسان کے بارے میں کیا کہتے ہیں، جو نماز میں کسی پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگائے؟ اس نے کہا، اس کی نماز باطل ہے، اس نے پھر پوچھا کہ اس کے وضو کا کیا بنے گا؟ اللولوی نے کہا کہ وہ برقرار رہے گا، اس نے اللولوی سے پوچھا کہ اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں، جو نماز میں ہنس پڑے؟ اس نے جواب دیا کہ اس کا وضو اور نماز دونوں باطل ہیں، اس نے کہا کہ میں نے اللولوی

سے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک نماز میں پاک دامن عورت پر زنا و بدکاری کی تہمت لگانا، نماز میں ہنسنے کے مقابلے میں چھوٹا جرم ہے (کہ وہاں صرف نماز ٹوٹی اور یہاں وضو اور نماز دونوں)؟ اس پر اللولوی نے جوتے پکڑے اور بھاگ گیا، امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے فضل بن ربیع کو کہا کہ میں نے تو آپ کو پہلے بتایا تھا کہ یہ مناظرہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔'' (الکامل لابن عدی: ۳۱۹/۲، وسندہ حسن)

اس مناظرہ کے راوی ابوجعفر محمد بن زاہر النسائی کے بارے میں امام ابوحاتم الرازی فرماتے ہیں:

لم یکن به بأس. (الجرح والتعدیل: ۲٦۰/۷)

قارئین! اب آپ خود فیصلہ کریں کہ دین وایمان کے خلاف ایسے مضحکہ خیز اور سنسنی خیز مسائل بیان کرنے والے دین کے خیرخواہ ہوسکتے ہیں؟ شریعت کی اس مخالفت کو آپ کیا نام دیں گے؟

☆............☆............☆

نا امیدی: ابوعبداللہ

نا امیدی جائز نہیں، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں دو طریقے سے سوءِ ظن ہے:

۱......نا امید آدمی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ کام نہیں کرسکتا، حالانکہ وہ ہر چیز پر ہر وقت قادر ہے۔

۲......وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو ناقص سمجھتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ رحیم ہے، کسی بندے پر کسی بھی وقت رحم کرسکتا ہے، اس کی رحمت سے نا امید آدمی گمراہ ہوتا ہے، چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ﴾ (الحجر: ٥٦)

''اپنے رب کی رحمت سے صرف گمراہ لوگ ہی نا امید ہوتے ہیں۔''

لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ڈر دل میں رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی رحمت کی امید بھی رکھی جائے۔

نا امیدی کے دو اسباب ہیں:

۱......یہ کہ آدمی اپنی جان پر ظلم اور گناہوں پر جسارت کرتا رہے، ان پر مصر اور قائم رہنے کا عزم کرلے، پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ختم کرلے، یہ سمجھتے ہوئے کہ اس نے رحمت کے اسباب ختم کردیئے ہیں، آخر کار یہ نا امیدی اس کی عادت بن جاتی ہے اور شیطان انسان سے زیادہ سے زیادہ یہی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔

۲......یہ کہ انسان اپنے کیے ہوئے جرائم کی وجہ سے اتنا ڈر اپنے اوپر سوار کرلے کہ لاعلمی میں یہ سمجھ بیٹھے کہ اب اللہ تعالیٰ اسے معاف ہی نہیں کرے گا، اگرچہ وہ سچی توبہ ہی کرلے، یوں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوجاتا ہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ گناہوں پر مصر نہ رہے، بلکہ ان کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے حضور سچی اور پکی توبہ کرلے، پھر یہ عقیدہ رکھے کہ توبہ کے سبب بڑے سے بڑے گناہ بھی معاف ہوجاتے ہیں، یہی نا امیدی کا خاتمہ ہے۔

آؤ عمل کریں ! غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

عمل نمبر ۱: سفر سے واپسی پر گھر جانے سے پہلے مسجد میں دو رکعتیں

انسان زندگی کے اس سفر میں کئی سفر کرتا ہے، اس حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی یہ ہے کہ سفر سے واپسی پر مسجد میں جا کر دو رکعتیں نماز ادا کرنے کے بعد گھر کا رخ کرے، یہ سنت مہجورہ ہے، کتنے لوگ اس سے غافل ہیں، اس پیاری سنت کو زندہ کرنے کی اشد ضرورت ہے، جیسا کہ:

(۱)......سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((کان النّبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم إذا قدم من سفر بدأ بالمسجد فصلیّٰ فیہ))

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے واپس تشریف لاتے، تو ابتدا مسجد کے ساتھ کرتے، (یعنی سب سے پہلے مسجد جاتے) اس میں (دو رکعت) نماز ادا کرتے۔'' (صحیح بخاری: ۳۰۸۸، صحیح مسلم: ۷۱٦)

ایک روایت میں ہے:

((ثُمَّ جَلَسَ فِیہِ))

''پھر اس میں بیٹھتے۔'' (مسلم: ۷۱٦)

حافظ نووی (۶۳۱۔۶۷۶ھ) ایک حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

فی ھذہ الأحادیث استحباب الرّکعتین للقادم من سفرہ فی المسجد أوّل قدومہ وھذہ الصّلوۃ مقصودۃ للقدوم من السّفر، تحیّۃ المسجد، والأحادیث المذکورہ صریحۃ.

''ان احادیث میں سفر سے واپس لوٹنے والے کے لیے سب سے پہلے مسجد میں دو رکعتیں ادا کرنے کے استحباب کا ثبوت ہے، یہ سفر سے لوٹنے والے کی نماز ہے، نہ کہ تحیۃ المسجد، احادیث مذکورہ اس پر صریح دلیل ہیں۔''

(شرح مسلم للنووی: ۲۴۸/۱)

امیر المؤمنین فی الحدیث فقیہ الأمت امام بخاریؒ نے اس حدیث پر ''باب الصلوۃ إذا قدم من سفر'' قائم کیا ہے۔

(۲)......سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

((اشتریٰ منی رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم بعیرا، فلمّا قدم المدینۃ أمرنی أن آتی المسجد فأصلیّ رکعتین))

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے اونٹ خریدا، جب آپ مدینہ تشریف لائے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مسجد میں آنے کا حکم دیا کہ میں اس میں دو رکعتیں ادا کروں۔'' (صحیح بخاری: ٤٤٣، صحیح مسلم: ۷۱۵، واللفظ لہٗ)

(۳)......سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

((ان رسول اللہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم حین أقبل من حجتہ، دخل المدینۃ، فأناخ علی باب مسجدہ، ثمّ دخلہ، فرکع فیہ رکعتین، ثمّ انصرف الی بیتہ.

''رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب حج سے واپس ہوئے تو آپ نے مدینہ میں داخل ہوکر اپنی مسجد کے دروازے پر سواری کو بٹھا دیا، پھر مسجد میں داخل ہوکر دو رکعتیں ادا کیں، پھر اپنے گھر کی طرف لوٹ گئے۔''

ابن عمر رضی اللہ عنہ کے شاگرد ''نافع'' بیان کرتے ہیں کہ سیدنا ابن عمر کا بھی یہی طریق کار تھا۔

(مسند الامام احمد: ۱۲۹/۲، سنن ابی داؤد: ۲۷۸۲، وسندہ صحیح)

فائدہ:

۱......ابو صالح کہتے ہیں:

((انّ عثمان کان إذا قدم من سفر، صلیٰ رکعتین))

''سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ جب سفر سے آتے تو دو رکعتیں ادا فرماتے'' (مصنف ابن أبی شیبہ: ۸۲/۲)

وسندہ حسن ان صحّ سماع أبی صالح عن عثمان، وهو نفسه صدوق حسن الحدیث، قال الذهبی فیه: ثقه (میزان الاعتدال: ۵۳۹/۴)

۲......ایک دوسری روایت میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سفر سے واپسی پر مسجد میں بھی دو رکعتیں پڑھنا ثابت ہے۔ (فضل الصلاۃ علی النبیؐ للامام اسماعیل بن اسحاق القاضی: ۹۹، وسندہٗ صحیح)

☆............☆............☆

عمل نمبر ۲ گھر سے نکلتے اور داخل ہوتے وقت کی نماز

(۱)......سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

اذا دخلت منزلک فصل رکعتین تمنعانک مدخل السوء، واذا خرجت من منزلک فصل رکعتین تمنعانک مخرج السوء.

''جب تم اپنے گھر میں داخل ہو تو دو رکعتیں ادا کرو، وہ تمہیں اندرونی برائی سے محفوظ رکھیں گی، اسی طرح جب تم گھر سے نکلو تو دو رکعتیں ادا کرو، وہ تمہیں بیرونی نقصان سے بچائیں گی۔'' (کشف الاستار: ۷۴۶، وسندہ صحیح)

حافظ ہیثمی کہتے ہیں: **رجاله موثقون**۔ (مجمع الزوائد: ۲۸۳/۲-۲۸۴)

۲......موسیٰ بن ابی موسیٰ اشعری رحمہ اللہ کہتے ہیں:

((انّ ابن عباس قدم من سفر فصلیٰ فی بیته رکعتین علی طنفسة))

''سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ایک سفر سے واپس آئے تو اپنے گھر میں چٹائی پر دو رکعتیں ادا کیں۔''

(مصنف ابن أبی شیبہ: ۸۲/۲، وسندہٗ حسن)

عمل نمبر ۳:

شہر بن حوشب کہتے ہیں کہ میں نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ وہ کہہ رہی تھیں کہ سیدہ فاطمہ

رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، آپ سے کام کی شکایت کی، کہنے لگیں، اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم، چکی پیسنے کی وجہ سے میرے ہاتھوں پر چھالے پڑ گئے ہیں، آٹا پیستی ہوں، پھر گوندھتی ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا، اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کے مقدر میں کچھ لکھا ہے، وہ آپ کو ضرور ملے گا، میں آپ کو اس سے بہتر چیز کی راہنمائی کرتا ہوں کہ جب آپ سونے کے لیے بستر پر لیٹیں تو ۳۳ مرتبہ ''سبحان اللہ''، ۳۳ بار ''اللہ اکبر'' اور ۳۴ بار ''الحمد للہ'' کہو، یہ پورا سو ہے، جو کہ خادم سے کہیں زیادہ بہتر ہے، نمازِ فجر اور نمازِ مغرب کے بعد دس دس مرتبہ یہ ذکر کریں:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ، يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ ، بِيَدِهِ الْخَيْرُ ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ .

''اللہ کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، وہ (ذات وصفات میں) اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی بادشاہت ہے، تعریف وثناء بھی اسی کی ہے، وہی زندہ کرتا ہے، وہی مارتا ہے، اسی کے ہاتھ میں خیر و بھلائی ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

ہر ایک کے بدلے میں دس نیکیاں لکھ دی جائیں گی، دس گناہ مٹا دیے جائیں گے، اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک گردن آزاد کرنے کا اجر وثواب ملے گا، شرک کے علاوہ کوئی گناہ گرفت نہیں کر سکے گا

لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَحْدَهٗ لَا شَـرِيْكَ لَهٗ. یہ آپ کے لیے صبح سے شام تک ہر شیطان اور ہر برائی سے بچاؤ کا ہتھیار ہے۔ (مسند الامام احمد : ۲۹۸/۶، المعجم الکبیر للطبرانی : ۳۳۹/۲۳، وسندہ حسن)

حافظ ہیثمی فرماتے ہیں: اسنادهما حسن .

''(احمد اور طبرانی) دونوں کی سند حسن ہے۔'' (مجمع الزوائد : ۱۰۸/۱۰، ۱۲۲)

اس حدیث کے راوی شہر بن حوشب کو امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین، امام ابوزرعہ، امام عجلی، امام بخاری، امام ابو حاتم الرازی، امام یعقوب بن شیبہ، امام یعقوب بن سفیان الفسوی اور جمہور نے توثیق کی ہے، نیز خطیب بغدادی (موضع الاوهام بین الجمع والتفریق : ۱/ ۳۶۰) اور محدث المؤمل بن احمد (فوائد المؤمل : ۴۶) نے اس کی حدیث کی سند کی تحسین کر کے توثیق کی ہے۔ یہ حسن الحدیث ہے۔ حافظ ذہبی نے اس کے ترجمہ کے شروع میں [صح] لکھا ہے، اس کا مطلب ہے کہ ذہبی کے نزدیک اس پر جرح مردود ہے اور توثیق راجح ہے، جیسا کہ حافظ ابن الملقن اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: [صح] واصطلاحه أن العمل على توثيقه .

''[صح] ذہبی کی اصطلاح ہے کہ اس راوی کی توثیق ہی راجح ہے۔''

(البدر المنیر لابن الملقن : ۶۰۸/۱، لسان المیزان لابن حجر : ۱۵۹/۲ ترجمہ حارث بن محمد بن ابی اسامہ)

اس بارے میں حافظ ذہبی لکھتے ہیں: الرجل غير مدفوع عن صدق وعلم والاحتجاج به مترجح .

''اس راوی کا صدق وعلم ثابت ہے، اس کی حدیث سے حجت پکڑنا ہی راجح ہے۔'' (سیر أعلام النبلاء : ۳۷۸/۴)

حافظ ہیثمی اس راوی کے بارے میں کہتے ہیں: وحديثه حسن . ''اس کی حدیث حسن ہوتی ہے''

(مجمع الزوائد : ۱۰۸/۱۰)

نیز کہتے ہیں: **والصحیح أنهما ثقتان ولا یقدح الکلام فیهما.**

''صحیح بات یہ ہے کہ (عبدالحمید بن بہرام اور شہر بن حوشب) دونوں ثقہ ہیں، ان میں جرحی کلام قابلِ قدح نہیں۔''

(مجمع الزوائد : ۲۲۲/۱)

☆............☆............☆

عمل نمبر٤:

صحابی رسول مسلم بن حارث التیمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے سرگوشی کرتے ہوئے فرمایا کہ جب آپ نمازِ مغرب سے فارغ ہوں تو سات مرتبہ یہ دعا پڑھیں:

اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ.

''اے اللہ! مجھے جہنم سے پناہ دے۔''

اگر آپ نے یہ دعا پڑھ لی اور اسی رات فوت ہو گئے تو جہنم سے پناہ لکھ دی جائے گی، جب آپ نمازِ فجر پڑھ لیں تو یہی دعا پڑھ لیں، اگر اس دن فوت ہو گئے تو جہنم سے پناہ لکھ لی جائے گی۔'' (سنن ابی داؤد : ۵۰۷۹، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام ابن حبان (۲۳۴۶۔الموارد) نے ''صحیح'' کہا ہے۔

حافظ ابن حجر نے اس کو ''حسن'' کہا ہے۔ (نتائج الافکار : ۳۲۶/۲)

اس کے راوی حارث بن مسلم کو امام دارقطنی نے ''مجہول'' کہا ہے، جبکہ امام ابن حبان اور حافظ ہیثمی اس کو ''ثقہ'' کہتے ہیں۔ (مجمع الزوائد : ۹۹/۸)

اس پر جرح مفسر نہیں ہے، اس کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے، لہٰذا یہ ''حسن الحدیث'' ہے، حافظ ابن حجر ایک اصول بیان کرتے ہیں:

وأما حالها فقد ذکرت فی الصحابة، وان لم یکن یثبت لها صحبة، فمثلها لا یسأل عن حالها.

''جہاں تک (رباح کی دادی) کی عدالت کا تعلق ہے تو اس کو صحابہ میں ذکر کیا گیا ہے، اگرچہ اس کا صحابیہ ہونا ثابت نہ بھی ہوگا، تب بھی اس کیسی راویہ کی عدالت کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔'' (التلخیص الحبیر : ۷٤/۱)

اس اصول کے مطابق حارث بن مسلم کی عدالت ثابت ہوتی ہے، لہٰذا یہ ''حسن الحدیث'' ہے۔

☆............☆............☆

کوئی صحیح حدیث قرآن کے مخالف نہیں

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

منکرین حدیث درحقیقت منکرین قرآن ہیں، ان کے عدمِ فہم وعلم کے بارے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

يقرؤون القرآن ، لا يجاوز حلوقهم و حناجرهم ، يمرقون من الدين مروق السهم من الرمية.

''وہ قرآن پڑھیں گے، لیکن وہ ان کے حلقوں سے تجاوز نہیں کرے گا، وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے، جس طرح تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔'' (صحیح بخاری:٦٩٣١)

یہ حدیث خوارج (منکرین حدیث وغیرہ) کے عدمِ فہم وعلم پر بیّن ثبوت ہے، کیونکہ وہ قرآن وحدیث کی توہین اور مسلمانوں کی تکفیر کے مرتکب ہیں۔

حافظ ابنِ حجر لکھتے ہیں:

ورد الروايات الصحيحة والطعن فى أئمة الحديث الضابطين مع امكان توجيه ما رووا من الأمور التى أقدم عليها كثير من غير أهل الحديث ، وهو يقتضى قصور فهم من فعل ذلك منهم ، ومن ثم قال الكرمانى : لا حاجة لتخطئة الرواة الثقاة .

''بہت سے غیر اہل حدیثوں نے احادیثِ صحیحہ اور روایاتِ ثابتہ کا ردوانکار کیا ہے، حفاظ ائمہ حدیث پر طعن زنی کی ہے، یہ اقدام ان کے ناقص العقل وقاصر الفہم ہونے پر دلیل ہے، اسی وجہ سے کرمانی (شارحِ بخاری) نے کہا ہے کہ ثقہ راویوں کی طرف خوامخواہ غلطی کی نسبت کرنے کی ضرورت نہیں (بلکہ ان کی روایتوں میں جمع وتوفیق اور تطبیق دینا ضروری ہے)۔'' (فتح الباری:٤٠١/١٣)

منکرین حدیث نے قرآن وحدیث کے اتباع کی بجائے عقل سوء اور نفسانی خواہشات کی پرستش شروع کردی ہے، ان کے زعمِ باطل کے مطابق حدیث دلیل شرعی نہیں ہے، وہ حدیث کو قرآن کی ضد خیال کرتے ہیں، جبکہ جہاں قرآن وحی ہے، وہاں حدیث بھی وحی ہے، وحی حق ہے، کیا حق حق کے ساتھ ٹکرا سکتا ہے؟ ایک حق کو دوسرے حق پر پیش کرنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ ایک مسلمان کا تو یہ شیوہ ہونا چاہیے کہ جو کچھ قرآن وحدیث کی صورت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، اس کو دل وجان سے برحق تسلیم کرے اور اس پر ایمان لائے، جیسا کہ امامِ زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

على الله البيان وعلى الرّسول البلاغ وعلينا التّسليم .

''بیان کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ پہنچانا ہے اور سرتسلیم خم کرنا ہم پر لازم ہے۔''

(الزهد لابن أبى عاصم :٧١، حلية الاولياء لأبى نعيم :٣٦٩/٣، عقيدة السلف أصحاب الحديث لأبى اسماعيل الصابونى، واللفظ له ، تغليق التعليق لابن حجر:٣٦٥/٥، وسنده صحيح)

یہ تو ہوا مومنوں کا وطیرہ، جبکہ گمراہ اور ظالم قرآن وحدیث میں ٹکراؤ پیدا کرنے کی مذموم کوشش کرتا ہے، اس طرح وہ متاعِ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، قرآن وحدیث میں کوئی تعارض نہیں، ہاں! ظاہری طور پر تعارض موجود ہے، حقیقت

میں کوئی تعارض نہیں، اہلِ ایمان نورِ ایمان وعلم سے تعارض کو رفع کر دیتے ہیں، جبکہ معاندین قصورِ فہم کی بنیاد پر گمراہی اور ضلالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں۔

حافظ خطابی لکھتے ہیں:

فانه يحذر بذلک مخالفة السنن التی سنها رسول الله(صلى الله عليه وسلم)مما ليس له فی القرآن ذكر على ما ذهبت اليه الخوارج والروافض ، فانهم تعلقوا بظاهر القرآن وتركوا السنن التی قد ضمنت بيان الكتاب فتحيروا وضلوا.

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ سنتیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں، ان کی مخالفت سے بچنا چاہیے، خارجیوں اور رافضیوں نے صرف قرآن کے ظاہر کو لیا ہے، جبکہ ان احادیث کو چھوڑ دیا ہے جو قرآن کی توضیح وتشریح پر مشتمل ہیں، اس لیے وہ گمراہ ہوگئے ہیں۔'' (معالم السنن: ٤/٢٩٨)

بقیہ بن ولید (ثقہ عند الجمہور) کہتے ہیں کہ امام اوزاعی نے مجھے فرمایا، ایسے لوگوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو اپنے نبی کی حدیث سے بغض رکھتے ہیں؟ میں نے عرض کی، وہ برے لوگ ہیں، آپ نے فرمایا:

ليس من صاحب بدعة تحدثه عن رسول الله صلّى اللّٰه عليه وسلّم بخلاف بدعته الّا أبغض الحديث.

''جس بدعتی کو بھی آپ اس کی بدعت کے خلاف حدیث سنائیں گے، وہ اسے برا سمجھے گا۔''

(شرف أصحاب الحديث للخطيب: ١٥٠، الحجة لأبی القاسم الأصبهانی: ٢٠٧/١، وسنده صحيح)

امامِ آجری فرماتے ہیں:

ينبغی لأهل العلم والعقل اذا سمعوا قائلا يقول : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فی شیء قد ثبت عند العلماء ، فعارض انسان جاهل ، فقال : لا أقبل الا ما كان فی كتاب الله (عز وجل)قيل له : أنت رجل سوء وأنت ممن حذرناک رسول الله صلى الله عليه وسلم وحذر منک العلماء.

''اہلِ علم وعقل کو چاہیے کہ جب وہ کسی کو صحیح ثابت فرمانِ رسول بیان کرتے ہوئے سنیں اور کوئی جاہل انسان اسے سن کر یہ کہے کہ میں صرف قرآن کو مانتا ہوں، اسے کہا جائے کہ تو برا انسان ہے، تجھ جیسے لوگوں سے ہمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور علمائے کرام نے خبردار کیا تھا۔'' (الشريعة : ٤٩)

امامِ شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لا تخالف سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم كتاب الله بحال.

''کسی بھی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرآن کریم کے مخالف نہیں ہوسکتی۔''

(الرّسالة للشافعی : ٥٤٦)

محقق شاطبی لکھتے ہیں:

التعارض اما ان یعتبر من جهة ما فی نفس الامر ، واما من جهة نظر المجتهد ، اما من جهة ما فی نفس الامر فیغیر ممکن بالاطلاق...

''تعارض کی دو قسمیں ہیں، یا تو حقیقی ہوگا یا صرف مجتہد کی نظر میں ہوگا، (قرآن و حدیث میں) حقیقی تعارض بالکل ناممکن ہے۔'' (الموافقات: ٤/٢٩٤)

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حدیث قرآن پر پیش کرو، اگر قرآن کے موافق ہو تو لے لو، اگر مخالف ہو تو چھوڑ دو، ہمارا ان سے سوال ہے کہ جب قرآن قرآن سے ٹکرائے، اس صورت میں تم قرآن کی کس آیت کو لوگے اور کس کو چھوڑو گے؟ جو ان کا جواب ہوگا، وہی ہمارا قرآن و حدیث میں تعارض کے حوالے سے جواب ہو جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ گرامی ہے:

لا ألفین أحدکم متکئا علی أریکته ، یاتیه الأمر من أمری مما أمرت به أو نهیت عنه ، فیقول : لا ندری ، ما وجدنا فی کتاب الله اتبعناه .

''میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ وہ اپنے صوفہ پر ٹیک لگائے ہوئے ہو اور اس کو امر یا نہی کی صورت میں میرا فرمان پہنچے تو وہ کہے کہ ہم نہیں جانتے، ہم تو صرف قرآن کی اتباع کریں گے۔''

(أبو داؤد: ٤٦٠٥، ترمذی: ٢٦٦٣، ابن ماجه: ١٣، مسند الحمیدی: ٥٥١، دلائل النبوة للبیهقی: ٦/٥٤٩، وسنده صحیح)

اس حدیث کو امامِ ترمذی نے ''حسن صحیح''، نیز امام ابن حبان (١٣) اور امامِ حاکم (١/١٠٨، ١٠٩) نے ''صحیح'' کہا ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، حافظ بغوی نے بھی اس کو ''حسن'' قرار دیا ہے۔ (شرح السنة: ١/٢٠١)

حافظ بغوی اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں: وفی الحدیث دلیل علی أنه لا حاجة بالحدیث الی أن یعرض علی الکتاب ، وأنه مهما ثبت عن رسول الله صلی الله علیه وسلم کان حجة بنفسه .

''یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حدیث کو قرآن پر پیش کرنے کی قطعی طور پر کوئی ضرورت نہیں، بلکہ جب وہ حدیث صحیح ہو تو بذاتِ خود حجت شرعی ہوگی۔'' (شرح السنة: ١/٢٠١-٢٠٢)

قرآن اور حدیث کے مابین تعارض کی مثال ملاحظہ فرمائیں:

متواتر حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انکم سترون ربکم کما ترون هذا القمر ، لا تضامون فی رؤیته ....

''یقیناً عنقریب تم اپنے رب کو دیکھو گے، جس طرح بھیڑ کے بغیر چاند دیکھتے ہو۔''

(صحیح بخاری: ٧٤٣٤، صحیح مسلم: ٦٣٣)

قرآن مجید میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دیدار کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَنْ تَرَانِیْ﴾ (الاعراف: ١٤٣) ''(اے موسیٰ!) آپ مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔''

حدیثِ پاک میں دیدارِ الٰہی کا ثبوت ہے اور قرآن پاک اس کی نفی کر رہا ہے، منکرین حدیث اس تعارض کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث ''صحیح'' نہیں، بالفرض اس کو ''صحیح'' مان لیا جائے تو اس سے مراد ''علم'' ہے نہ کہ دیدارِ الٰہی۔ بطورِ دلیل وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پیش کرتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾(النور:٤١)

''کیا آپ کو علم نہیں کہ آسمان وزمین کی ہر چیز اس کی تسبیح کرتی ہے؟''

تو اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث متواتر ہے، اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں، قرآن نے جس دیدارِ الٰہی کی نفی کی ہے، اس کا تعلق دنیا سے ہے، حدیث پاک نے جس کا اثبات کیا ہے، اس کا تعلق آخرت سے ہے، یعنی دنیا میں کوئی آنکھ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتی، البتہ آخرت میں وہ مومنوں کو اپنا دیدار دے گا، لہٰذا تعارض ختم ہوا، یہاں رؤیت کی تعبیر علم سے کرنا قرآن وحدیث اور صحابہ کرام وسلف صالحین کے متفقہ فہم وتصریحات کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ☆ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾(القیامۃ:٢٢-٢٣)

''اس دن (قیامت کو مومنوں کے) چہرے شگفتہ اور بارونق ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔''

نظر کی نسبت چہرے کی طرف کی گئی ہے، جو کہ آنکھوں کا محل ہے، اس کو ''الیٰ'' کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ یہ رؤیت بصری ہوگی نہ کہ قلبی، یہ اہل جنت پر اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہوگا اور جو منکر ہوگا، وہ اس سے محروم رہے گا۔

ان کی اس باطل تاویل کا رد اسی حدیث میں موجود ہے، جب صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روزِ قیامت ہونے والے دیدارِ الٰہی کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

هل تضارون فی رؤية الشمس بالظهيرة صحوا، ليس معها سحاب ؟ وهل تضارون فی رؤية القمر ليلة البدر صحوا ، ليس فيها سحاب؟ قالوا : لا ، يارسول الله ! قال : ما تضارون فی رؤية الله تبارک وتعالیٰ يوم القيامة الا كما تضارون فی رؤية أحدهما.

''جب سورج نصف النہار پر ہو اور اس کے ساتھ کوئی بادل بھی نہ ہو تو کیا تمہیں سورج دیکھنے میں کوئی دقت یا دشواری ہوتی ہے؟ اور جب چودھویں رات کو آسمان پر چاند جلوہ آرا ہو اور اس پر بادل بھی نہ ہو تو کیا چاند دیکھنے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے؟ صحابہ نے عرض کی نہیں، اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا، جس طرح تم دنیا میں سورج یا چاند کو دیکھتے ہو، اسی طرح روزِ قیامت اللہ تبارک وتعالیٰ کا دیدار کرلو گے۔''(صحیح مسلم: ١٨٣)

اس حدیث نے واضح کر دیا ہے کہ دیدار بصری ہوگا نہ کہ قلبی۔

امام ابن قتیبہ لکھتے ہیں:

ولو كان اللّٰه تعالیٰ لا يری فی حال من الأحوال ولا يجوز عليه النظر ، لكان موسیٰ عليه السلام قد خفی عليه من وصف اللّٰه ما علموه.

''اگر کسی صورت میں بھی اللہ تعالیٰ کا دیدار ناممکن ہوتو یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کے جس وصف کو موسیٰ علیہ السلام

نہ جان سکے، اسے منکرین حدیث جان گئے۔'' (تاویل مختلف الحدیث: ۲۰۷)

منکرین حدیث کا خود ساختہ اصول باطل ہوا کہ حدیث کو قرآن پر پیش کیا جائے، اگر قرآن کے موافق ہو تو لے لی جائے اور اگر قرآن کے مخالف ہو تو چھوڑ دی جائے۔ خوب یاد رہے کہ کوئی صحیح حدیث قرآن کے مخالف نہیں ہوتی، ظاہری مخالفت ہو سکتی ہے، حقیقت میں کوئی مخالفت نہیں ہو سکتی، لہٰذا ایک صحیح، مرفوع اور متصل حدیث پیش کی جائے جو قرآن کے خلاف ہو، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم اس تعارض کو رفع کر دیں گے، اگر قرآن کا ظاہری تعارض رفع ہو سکتا ہے تو قرآن و حدیث کا ظاہری تعارض دور کیوں نہیں ہو سکتا؟ اگر دور نہ ہو تو یہ سمجھ کا قصور ہوگا۔

منکرین حدیث اس مرض میں مبتلا ہیں، شیطان ان کی طرف باطل القاء کرتا ہے، ان کی عقلیں سقیم اور فاسد ہو چکی ہیں، شبہات و وساوس کے اندھیروں سے ان کے سینے لبریز ہو چکے ہیں، ان کی دلیلیں جو درحقیقت شبہات ہیں، باطل ثابت ہو چکی ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مصداق ہیں:

﴿وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ (الحج: ۱۸)

''اور جسے اللہ ذلیل کرے، اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں، یقیناً اللہ جو چاہتا ہے، سو کرتا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ﴾ (محمد: ۲۳)

''یہ (منکرین حدیث جو درحقیقت منکرین قرآن ہیں) وہ لوگ ہیں، جن پر اللہ نے لعنت کی ہے، پھر ان کو بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔''

حدیث جو حق ہے، اس کو نہ سن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں۔

قوام السنۃ امام ابو القاسم اسماعیل بن محمد الاصبہانی نے کیا خوب لکھا ہے:

وقول من قال: تعرض السنة على القرآن، فان وافقت ظاهره، والا استسلمنا ظاهر القرآن وتركنا الحديث، فهذا جهل، لأن سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم مع كتاب الله عز وجل تقام مقام البيان عن الله عزوجل، وليس شيء من سنن رسول الله صلى الله عليه وسلم يخالف كتاب الله لأن الله عزوجل أعلم خلقه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم يهدى الى صراط مستقيم فقال: ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (الشورٰى: ۵۲) وليس لنا مع سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم من الأمر شيء الا اتباع والتسليم ولا يعرض على القياس ولا غيره، وكل ما سواها من قول الآدميين تبع لها ولا عذر لاحد يتعمد ترك السنة، ويذهب الى غيرها، لأنه لا حجة لقول أحد مع رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا صحّ.

''منکرین حدیث کا یہ کہنا کہ سنت کو قرآن پر پیش کیا جائے گا، اگر وہ قرآن کے موافق ہوئی تو ٹھیک ورنہ ہم قرآن کے ظاہر کو لے لیں گے اور حدیث کو چھوڑ دیں گے، نری جہالت ہے، کیونکہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے موافق

ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے قرآن کی تفسیر و بیان اور تشریح ہے، کوئی سنت قرآن کے مخالف و معارض نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اس بات سے باخبر کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سیدھی راہ کی راہنمائی فرماتے ہیں، فرمایا: ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (الشوریٰ: ۵۲) (آپ ضرور ضرور صراطِ مستقیم کی ارشاد و راہنمائی فرماتے ہیں)۔ ہمارے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع و تسلیم کے بغیر کوئی چارہ نہیں، نیز حدیث کو قیاس وغیرہ پر بھی پیش نہیں کیا جائے گا، امتیوں کے اقوال و افعال تو حدیث کے تابع ہیں (اگر حدیث کے موافق ہوں تو لے لیں گے، ورنہ ترک کر دیں گے) کسی کے لیے جان بوجھ کر سنت کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف جانے کی گنجائش نہیں ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول صحیح ثابت ہو جائے تو اس کے خلاف کسی کا قول حجت نہیں ہے۔" (الحجة فی بیان المحجة : ۲/۴۲۵-۴۲۶)

اہل سنت کے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

من رد حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو على شفا هلكة .

"جس نے حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رد کر دیا، وہ تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑا ہے۔"

(الحجة فی بیان المحجة : ۱/۲۰۷، مناقب الامام احمد لابن الجوزی : ۱۸۲، وسنده حسن)

قوام السنۃ ابو اسماعیل الاصبہانی لکھتے ہیں:

"آدمی پر اہل بدعت سے بغض لازم ہے، وہ جہاں بھی ہوں، تاکہ وہ اللہ کی خاطر محبت اور اللہ کی خاطر بغض و نفرت کرنے والوں میں سے ہو جائے، اہل سنت سے محبت اور اہل بدعت سے بغض و نفرت کی کچھ علامات ہیں، جب کسی شخص کو آپ امامِ مالک بن انس، امامِ سفیان بن سعید الثوری، امام عبد الرحمٰن بن مہدی، امام عبد اللہ بن مبارک، امام محمد بن ادریس الشافعی اور دیگر صحیح العقیدہ ائمہ کرام رحمہم اللہ کا ذکرِ خیر کرتے دیکھیں، تو جان لیں کہ وہ اہل سنت میں سے ہے اور جب کسی کو دیکھیں کہ وہ اللہ کے دین اور اس کی کتاب میں جھگڑا کر رہا ہے، اسے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے، تو وہ کہتا ہے کہ ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے، جان لیں کہ وہ بدعتی ہے، جب کسی آدمی کو کہا جائے کہ تو حدیث کیوں نہیں لکھتا؟ وہ کہتا ہے کہ عقل بہتر ہے، جان لیں کہ وہ بھی بدعتی ہے، جب آپ دیکھیں کہ کوئی اہل فلسفہ و ہندسہ کی مدح سرائی کر رہا ہے، تو جان لیں کہ وہ گمراہ ہے، جب کسی کو دیکھیں کہ وہ اہل حدیث کو "حشویہ، مشبہہ اور ناصبہ" کہہ رہا ہو، تو جان لیں کہ وہ بدعتی ہے، جب کوئی صفاتِ الٰہی کی نفی یا ان کو مخلوق سے تشبیہ دے رہا ہو، تو جان لیں کہ وہ گمراہ ہے۔"

(الحجة فی بیان المحجة : ۲/۵۳۹-۵۴۰)

اللہ رب العزت کا ارشادِ گرامی ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰)

"جس نے رسول کی اطاعت کی، درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی۔"

یہ آیتِ کریمہ نص ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال و احوال اللہ کی وحی ہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اللہ کی وحی کے تابع ہیں، تو ان کو قرآن کریم پر پیش کرنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

حافظ ابن حزم فرماتے ہیں:

....فصح ان كلام رسول الله صلى الله عليه وسلم كله فى الدين وحى من عند الله عز وجل ، لا شک فى ذلک ولا خلاف بين أحد من أهل اللغة والشريعة فى أن كل وحى نزل من عند الله فهو ذكر منزل .

''یہ لاریب حقیقت ہے کہ دین کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری کی ساری باتیں وحیِ الٰہی ہیں ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کے منزل من اللہ ذکر ہونے میں لغت وشرع میں کوئی اختلاف نہیں۔''

(الاحکام لابن حزم: ۱۳۵/۱)

حسان بن عطیہ تابعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: كان جبريل ينزل على رسول الله صلى الله عليه وسلم بالسنة كما ينزل عليه القرآن ويعلمه اياها كما يعلمه القرآن .

''جبریل امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سنت کے لیے بھی نازل ہوتے تھے، جس طرح کہ قرآن کے لیے نازل ہوتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنت کی ویسے ہی تعلیم دیتے تھے، جس طرح قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔''

(السنۃ لمحمد بن نصر المروزی: ۱۱۶،۱۰۲۸ وسندہ صحیح)

ابوالبقاء الحسینی الحنفی کہتے ہیں:

والحاصل أن القرآن والحديث يتحدان فى كونهما وحيا من عند الله بدليل : ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى﴾ (النجم:۵)

''الحاصل، فرمانِ الٰہی: ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى﴾ (النجم:۵) کے مطابق قرآن وحدیث دونوں وحی ہونے میں متحد و متفق ہیں۔'' (کلیات ابی البقاء: ۲۸۸)

علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

وقد اتفق من يعتد به من أهل العلم على أن السنة المطهرة بتشريع الأحكام ، وأنها كالقرآن فى تحليل الحلال وتحريم الحرام .

''معتبر علمائے اسلام سنتِ مطہرہ کی مستقل تشریعی حیثیت پر متفق ہیں، یقیناً یہ حلال وحرام میں قرآن کی طرح ہے۔''

(ارشاد الفحول للشوکانی: ۳۳)

نیز فرماتے ہیں: ان ثبوت حجية السنة المطهرة واستقلالها بتشريع الأحكام ، ضرورة دينية ، ولا يخالف فى ذلک الا من لا حظ له فى دين الاسلام .

''سنتِ مطہرہ کی حجیت اور اس کا احکام شرعیہ کا مستقل مصدر ہونے کا ثبوت ضرورتِ دینی ہے، اس میں اختلاف وہی کرتا ہے، جس کا دین اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔'' (ارشاد الفحول: ۳۳)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء:۵۹)

’’اے اہل ایمان ! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔‘‘

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کا حکم دیا تو ’’اطیعوا‘‘ کا صیغہ امر الگ الگ ذکر فرمایا، جب اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا، تو صیغہ امر نہیں دہرایا، بلکہ عطف پر اکتفا کیا، اس سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مستقل بالذات دلیل ہیں، لہٰذا آپ کی احادیثِ مبارکہ کو کتاب اللہ پر پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

علامہ ابن القیم فرماتے ہیں:

فأمر تعالى بطاعته وطاعة رسوله ، وأما الفعل اعلاما بأن طاعة الرسول تجب استقلالا من غير عرض ما أمر به على الكتاب ، بل اذا أمر وجبت طاعته مطلقا ، سواء كان ما أمر به في الكتاب أو لم يكن فيه ، فانه أوتي الكتاب ومثله معه .

’’اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت اور اپنے رسول کی اطاعت کا حکم فرمایا، ’’اطیعوا‘‘ کو دوبار ذکر کر کے یہ باور کروایا کہ حدیث کو قرآن پر پیش کیے بغیر اطاعتِ رسول مستقل شرعی مصدر و ماخذ ہونے کی حیثیت سے واجب ہے، بلکہ جب حکم دیا تو مطلق طور پر اطاعتِ رسول واجب ہوگئی، خواہ اس بات کا حکم کتاب اللہ میں ہو یا نہ ہو، یقیناً آپ کو قرآن عطا کیا گیا ہے اور قرآن کے ساتھ اس کی مثل ایک اور چیز (حدیث) بھی دی گئی ہے۔‘‘ (اعلام الموقعین : ۴۸/۱)

مذکورہ آیتِ کریمہ کی تفسیر میں امام عطاء بن ابی رباح تابعی فرماتے ہیں:

أولو العلم والفقه ، وطاعة الرسول : اتباع الكتاب والسنة

’’اولی الامر سے مراد علماء و فقہاء ہیں اور اطاعتِ رسول کتاب و سنت کی پیروی کا نام ہے۔‘‘

(سنن الدارمی : ۲۲۵، تفسیر ابن جریر : ۱۴۷/۵، وسندہ صحیح)

قرآن و حدیث اور اجماعِ امت سے ثابت ہو چکا ہے کہ حدیث وحی ہے، اس کو قرآن پر پیش کرنا گمراہی اور ضلالت ہے، نیز اس کا انکار کفر ہے۔

حافظ سیوطی فرماتے ہیں: **ان من أنكر كون حديث النبي صلى الله عليه وسلّم قولا كان أو فعلا ، بشرطه المعروف في الأصول حجة ، كفر وخرج عن دائرة الاسلام ، وحشر مع اليهود والنصارى أو مع من شاء الله من فرق الكفرة .**

’’حدیث قولی ہو یا فعلی، اسے شرعی دلیل سمجھتے ہوئے، جس نے بھی انکار کیا، وہ کافر ہے اور دائرہ اسلام سے خارج ہے، اس کا حشر یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہوگا یا ان کافر فرقوں کے ساتھ جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ چاہے گا۔‘‘

(مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ : ۳)

حیاتِ محدثین کے درخشاں پہلو: گوشۂ اطفال:

سفر ہو تو ایسا!

حافظ ابو یحییٰ نورپوری

پیارے بچو! سفر تو آپ بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن میں آج آپ کو ایک عجیب و غریب سفر کی داستان سنانا چاہتا ہوں، امید ہے کہ جہاں یہ واقعہ آپ کی معلومات میں اضافے کا سبب بنے گا، وہاں نہایت سبق آموز بھی ہوگا۔

صدیوں پرانی بات ہے، سخت گرمی کا موسم تھا، تین طالبِ علم قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اپنے علاقے کو خیر باد کہتے ہوئے سمندر پار جانے کے لیے روانہ ہوئے، وہ اس بات پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہ تین مہینوں کا راشن ساتھ لے کر جا رہے ہیں اور اب تو کئی ماہ مسلسل علم حاصل کر کے وہ اپنی علمی پیاس کو قدرے بجھا سکیں گے، لیکن: ہوتا ہے وہی جو منظورِ خدا ہوتا ہے

اس دور میں انجنوں کی مدد سے چلنے والے بحری جہاز تو ہوتے نہیں تھے، عام طور پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہوتیں جو ہوا کے رحم و کرم پر چلتی تھیں۔ اگر قدرتی طور پر ہوا منزلِ مقصود کی طرف چل رہی ہوتی تو مسافروں کی ''پانچوں گھی میں'' ہو جاتیں، لیکن خدانخواستہ اگر ہوا مخالف سمت اختیار کر لیتی تو بسا اوقات کئی کئی ماہ مسافر سمندر میں ہی بھٹکتے رہتے اور کھانے پینے کا ختم ہونے یا راستہ بھول جانے کی وجہ سے آخر کار زندگی سے مایوس ہو جاتے۔ یوں سمندری لہروں کا شکار ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

ان طلبہ کے ساتھ بھی ایسے ہی حالات پیش آئے۔ ان کی کشتی بھی مخالف ہوا کی بھینٹ چڑھ گئی، لاکھ جتن کیے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پورے تین ماہ یہ ہوائی طوفان کشتی کو سمندر میں گھماتا پھراتا رہا، چند لقموں کے سوا سارا سامانِ خورد و نوش کام آ چکا تھا۔ ان بے چاروں کے پاس دعاؤں اور التجاؤں کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ ایک تو وہ تھے مسافر، دوسرے سفر بھی طلبِ علم کا تھا۔ ایسے مسافروں کے پاؤں میں تو فرشتوں جیسی مقدس مخلوق بھی اپنے نورانی پَر بچھانا فخر سمجھتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ جو ''ارحم الرّاحمین'' ہے، اس کی رحمت جوش میں کیوں نہ آجاتی؟ دعا قبول ہوئی اور کشتی کنارے جا لگی، لیکن آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!

اصل مصیبت کا آغاز اب ہوا۔ مشیتِ الٰہی کو ان کی آزمائش مقصود تھی اور وہ بھی اپنی دُھن کے ایسے پکے تھے کہ مصائب سے گھبرا کر علم کی راہ سے ہٹ جانا ان کے لیے مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا۔ اس لیے بے سروسامانی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے انجام سے بے خبر منزل کی جانب بڑھنے لگے۔ بھوک لگی تو بچے کھچے چند لقمے جو پاس تھے، وہ بھی نگل لیے۔

اب نہ کھانے کو کچھ تھا نہ پینے کو، سورج کی گرم لو اور صحرا کی تپتی ریت جہنم کا سا سماں پیدا کر رہی تھی۔ سارا دن چلتے چلتے گزر گیا۔ دور دراز تک کسی چرند پرند کا نام ونشان تک نہ تھا، سوائے موت کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، لیکن کھانے کی قلت اور پیاس کی شدت ان کے پایۂ استقلال میں لرزش پیدا نہ کر پائی۔ رات ہوئی تو ایک جگہ سو گئے۔ اگلے دن پھر منزل کی طرف

رواں دواں رہے۔اب تو زبانیں خشک ہو چکی تھیں اور قدم ڈگمگانے لگے تھے، پھر سارا دن یوں ہی گزرا۔رات ہوئی تو ایک جگہ گر گئے۔

کئی دنوں کی مسلسل بھوک اور پیاس نے ان کو کسی کام کا نہ چھوڑا تھا۔تیسرا دن تو گویا ان کے لیے قیامت ثابت ہوا۔ان کی حالت اتنی دگرگوں ہوگئی کہ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ایک طالب علم بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ذرا اندازہ کریں کہ بھوک پیاس نے اگر باقی دو ساتھیوں کے پلّے کچھ چھوڑا ہوتا تو وہ اسے سنبھالتے۔ان کو تو اپنی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔اس دھچکے کے بعد وہ اپنی موت کو اور قریب دیکھنے لگے تھے۔اسے وہیں چھوڑ کر دونوں پانی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، تھوڑی دور گئے تھے کہ دوسرا بھی گرمی اور پیاس کی تاب نہ لاتے ہوئے زمین بوس ہوگیا۔اس اکیلے ساتھی کی مصیبت کا ذرا تصوّر کریں جو اپنے دونوں دوستوں کو گرمی اور پیاس سے تڑپ کر گرتا ہوا دیکھ تو سکتا تھا، کچھ کر نہیں سکتا تھا۔یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد اس کے اپنے حواس بھی جواب دینے لگے تھے، لیکن پھر بھی ہمت کر کے اِدھر اُدھر پانی کی تلاش میں دوڑنے لگا۔

پھر وہی ہوا جو ہمیشہ سے سنتِ الٰہی ہے۔اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ اپنے دین کے طالبوں اور خادموں کو آزماتا ضرور ہے، لیکن کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ان کو جھنجھوڑتا ضرور ہے، لیکن کبھی ناکامی و نامرادی کا منہ نہیں دکھاتا۔اس کا وعدہ جو ہے: ﴿وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ﴾ (الحج: ٤٠)

''جو اللہ کے دین کے خادم ہوتے ہیں، اللہ ان کی ضرور ضرور مدد فرماتا ہے۔''

﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الروم: ٤٧) ''ہم پر مومنوں کی مدد لازم ہے۔''

دین کے ان جاں نثار طالب علموں کے مومن ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے؟ نیز آنے والے دنوں میں اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے دین کا بہت بڑا کام لینا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی مدد آ پہنچی۔اپنے دو ساتھیوں کی زندگی بچانے کے لیے نکلنے والا اکیلا طالبِ علم اچانک ایک قافلے کو دیکھتا ہے۔اسے زندگی کی ہلکی سی کرن محسوس ہوئی، چنانچہ اپنا کپڑا اہلا کر ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔قافلے والوں نے اسے دیکھا تو ٹھہر گئے۔گرمی اور پیاس اس پر بھی اپنا کام کر چکی تھی، قریب تھا کہ یہ بھی گر جاتا۔انہوں نے اسے پانی پلایا۔جب جان میں جان آئی تو ان کو لے کر اپنے ساتھیوں کی طرف دوڑا۔پہلے ایک تک پہنچے اور اسے پانی کے چھینٹے مارے، کچھ ہوش و حواس بحال ہوئے تو تھوڑا تھوڑا کر کے پانی پلایا، پھر دوسرے کے پاس دوڑے گئے اور اسے بھی پانی پلا کر ہوش میں لائے، پھر قافلے نے ان پر ترس کھایا اور کچھ سامانِ خورد و نوش ان کو مہیا کیا۔

اسی سفر میں ان کو بھوک کی وجہ سے ایک مردہ جانور کے انڈے پی کر بھی اپنی جان بچانا پڑی تھی۔

لیکن بھوک پیاس اور گرمی کی اتنی صعوبتیں اٹھانے کے بعد کیا وہ اپنے مشن سے دستبردار ہو گئے تھے؟ ہرگز نہیں! علم کی راہ میں ملنے والے یہ مصائب و آلام ان کو اس راہ سے ایک قدم بھی دور نہ کر سکے، بلکہ ان کے شوق میں اور اضافے کا سبب بن گئے، چنانچہ وہ ایک بار پھر نئے ولولے سے طلبِ علم کے لیے روانہ ہو گئے۔

(تقدمۃ الجرح والتعدیل :۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، وسندہ صحیح)

یہ (۲۱۴)ہجری کا واقعہ ہے،یعنی اسے رونما ہوئے قریباً بارہ سو برس بیت چکے ہیں،لیکن آج بھی دین کے ان شیدائی طلبا کے یہ کارنامے کتابی صورت میں اہلِ علم کے سامنے ہیں اور قیامت تک وہ انہیں اپنے لیے مشعلِ راہ بناتے رہیں گے۔ان شاءاللہ

ان طلبہ میں سے ایک کو''امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے،جو اپنے دور کے بہت بڑے محدث ہوئے اورعلمِ حدیث میں ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیے کہ بعد میں آنے والے ان کو فراموش کرکے حدیث کے میدان میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔

آپ امامِ بخاری اورامام ابوزرعہ الرازی کے ہم عصر،امامِ احمد بن حنبل کے شاگرد اورامامِ ابوداود،امامِ نسائی،امام ابنِ ماجہ اور دیگر بڑے بڑے محدثین کے استاذ تھے۔تمام ائمہ کرام نے بالاتفاق ان کی تعریف وتوثیق کی ہے۔

آپ کی زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ یہ بھی ہے کہ دورانِ سفر زادِراہ ختم ہونے پر مزید علمِ دین حاصل کرنے کے لیے اپنے کپڑے بیچ کر بھی گزارہ کیا تھا۔(تقدمۃ الجرح والتعدیل : ۳۶۳، وسندہ صحیح)

ہے کوئی طالبِ علم جو دنیا اورآخرت کی سعادتوں کو حاصل کرنے کے لیے آج بھی اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ کرتے ہوئے طلبِ علم کی مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنا یہ وعدہ پورا کرے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت: ٦٩)

''اور جو لوگ ہمارے (دین کے راستے) میں محنت کرتے ہیں،ہم ضرورضروران کو اپنے (کامیابی وکامرانی والے) راستے دکھاتے ہیں۔''

کیا آپ تیار ہیں؟

☆............☆............☆

داڑھی منڈوانا مجوسیوں کا کام ہے

ابوسعید

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

انهم يوفون سبالهم ويحلقون لحاهم ، فخالفوهم .

''وہ مونچھیں بڑھاتے ہیں اورداڑھیاں منڈواتے ہیں،تم ان کی مخالفت کرو۔''

(مصنف ابن ابی شیبہ : ٨/٥٦٦، ٥٦٧، الاوسط للطبرانی : ١٠٥٥، ١٦٤٥، السنن الکبرٰی للبیہقی : ١/١٥١، شعب الایمان للبیہقی : ٦٠٢٧، وسندہ صحیح)

امام ابن حبان (۵۴۷۶) نے اس حدیث کو''صحیح'' کہا ہے۔

اس کا راوی معقل بن عبیداللہ الجزری ''حسن الحدیث'' ہے۔